إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

ستمبر ۲۰۱۴ء

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ **البرہان** لاہور

جلد ۱۸، شمارہ ۹، ستمبر ۲۰۱۴ء / ذیقعدہ ۱۴۳۵ھ

مشمولات

○فکر و نظر

سیکولر پاکستان؟	مدیر	۴

○منہج غلبۂ دین

اسلامی انقلاب کیسے آ سکتا ہے؟		۵
تعمیرِ فرد اور سماجی تبدیلی۔ کرنے کے اہم ترین کام	ڈاکٹر محمد امین	۶
اعتراض سے اعتراف تک کا سفر مکالمہ	محمد رشید	۲۳

○تعلیم و تربیت

'اسلامی سکول' کچھ تو کریں	ڈاکٹر محمد امین	۳۳
علم الاسماء (۳)	چوہدری رفاقت علی	۴۳

○اتحادِ امت

پاکستان کی دینی قوتوں میں اتحاد وقت کی اہم ترین ضرورت	ڈاکٹر محمد علی	۴۹

○مدیر کے نام

مشرق وسطی اور داعش کی خلافت اسلامیہ	رحیم الدین	۵۲

○تبصرۂ کتب

عصر حاضر میں دین کا متوازن تصور از پروفیسر طارق بٹ		۵۳
اسلامی فلاحی ریاست از محمد وقاص خاں	مدیر	۵۳
جماعت اسلامی اور انتخابی سیاست	انجینئر مختار فاروقی	۵۴

فکر و نظر

سیکولر پاکستان؟

اسلام آباد میں عمران خاں اور طاہر القادری کے دھرنوں کو ایک ماہ سے زیادہ ہو گیا ہے لیکن بظاہر ان کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ ایک عام پاکستانی کو ان دھرنوں کے فوری سیاسی نتائج سے دلچسپی ہے اور ہمیں بھی ہے لیکن ہمیں اس سے زیادہ دلچسپی اس جدوجہد کے دور رس نتائج سے ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں کے مطالبے جائز ہیں۔ ہمارا انتخابی نظام کرپٹ ہے اور اسے یقینا بدلا جانا چاہیے۔ طاہر القادری صاحب بھوک ننگ، بیماری، ظلم اور جہالت کے خلاف بات کرتے ہیں تو وہ بھی صحیح کہتے ہیں ...... لیکن جو چیز ہمیں نظر آ رہی ہے وہ یہ کہ دونوں کی جدوجہد، کامیاب ہو یا ناکام...... دونوں صورتوں میں اس کا نتیجہ ہے اسلامی قدروں کی پامالی اور سیکولر پاکستان۔ فرد، معاشرے اور ریاست کو اسلام کے مطابق چلانا کبھی عمران خان کا ایجنڈا رہا ہی نہیں۔ دوسرے سیاسی لوگوں اور جماعتوں کی طرح مذہب کو بھی اپنے پروگرام میں وہ ضرورتاً شامل رکھتے ہیں کہ ان کے ووٹر مسلمان ہیں ورنہ ان کی سیاسی اپروچ خالصتاً سیکولر ہے اور اپنے جلسوں میں ناچ گانے کو متعارف کرانے کی جو بدعت انہوں نے ایجاد کی ہے، صوبہ خیبر پی کے میں انہوں نے انگریزی میڈیم کو جس طرح حکماً نافذ کیا ہے اور جو زبان وہ اپنے دھرنوں میں بولتے ہیں اس سے ان کی سیکولر فکر و عمل کا واضح اظہار ہوتا ہے۔

طاہر القادری صاحب کینیڈا میں مغرب کے لادینی نظام کی پیروی اور اسے بالا دست رکھنے کا حلف اٹھا چکے ہیں۔ پچھلے سالوں میں وہ اہل مغرب کی خوشنودی کے لیے جہاد اور طالبان کے خلاف متحرک رہے ہیں یہاں تک کہ بریلوی مکتب فکر سے تعلق رکھنے کے باوجود انہوں نے توہین رسالت کے بارے میں اپنے موقف کو الٹا دیا ہے اور اب دینی مدارس کی جگہ جدید تعلیم کے سیکولر ادارے قائم کرنے کے ارادے کا انہوں نے اظہار کر دیا ہے۔ جذباتی تقریروں، متضاد دعووں اور ڈراموں کی وجہ سے لوگ انہیں ذہنی مریض سمجھنے لگے ہیں۔ 'نظام مصطفی' اور 'مصطفوی انقلاب' کی اصطلاح ترک کر کے صرف 'انقلاب' تک آنا ان کے سیکولر عزائم کی نشان دہی کرتا ہے کہ وہ اب ایسے اسلام کے قائل ہیں جو اہل مغرب کے نزدیک قابل قبول ہو۔

اس لیے ہم اہل وطن سے اپیل کرتے ہیں خصوصاً ان لوگوں سے جو اس مملکت خداداد کو اسلامی اصول و اقدار کا گہوارہ بنانے کے متمنی ہیں کہ وہ ان سے ہوشیار رہیں۔ ان دونوں صاحبان کا ایجنڈا مغرب کی ملحدانہ فکر و تہذیب کی علمبردار قوتوں کی، گلوبلائزیشن کی پالیسی کے تحت، پاکستان میں سیکولرزم کو فروغ دینے کا ہے جو ہر اس شخص کے لیے ناقابل قبول ہے جو اسلام اور نظریۂ پاکستان کا قائل ہے اور پاکستانی فرد، معاشرے اور ریاست میں اسلامی اصول و اقتدار پر عمل اور غلبے کا قائل ہے۔

منہج غلبۂ دین		مدیر

اسلامی انقلاب کیسے آ سکتا ہے؟

اگرچہ طاہر القادری صاحب نے 'مصطفوی انقلاب' اور 'نظام مصطفیٰ' کا نعرہ عمداً ترک کر دیا ہے اور ان کی شخصیت قابل اعتماد نہیں ہے۔ اس کے باوجود ان کا چہرہ مذہبی ہے اور ان کے پیروکار سیاسی کارکن سے زیادہ مذہبی کارکن دکھتے بھی ہیں اور حقیقتاً ہیں بھی۔ اس لیے بعض ذہنوں میں یہ سوال منطقی طور پر پیدا ہو گیا ہے کہ کیا اس طرح کی احتجاجی سیاست سے اسلامی انقلاب آ سکتا ہے یا شریعت نافذ ہو سکتی ہے؟ ہماری یہ حتمی اور سوچی سمجھی رائے ہے (اور اس کے دلائل ہم بیان کرتے رہتے ہیں) کہ اس طرح کی جدوجہد سے غلبۂ دین کا ہرگز کوئی امکان نہیں ہے بلکہ موجودہ طرز کی جمہوری اور انتخابی جدوجہد سے بھی پاکستان میں غلبۂ دین کا راستہ کھلتا نظر نہیں آتا جیسا کہ پچھلے ٦٦ سال کے تجربے نے واضح کر دیا ہے۔

البرہان کے پچھلے ماہ کے شمارے میں عمر جاوید صاحب کا ایک مدلل مضمون شائع ہوا ہے کہ ریاست کے موجودہ اداروں کے ذریعے سلام نافذ ہو ہی نہیں سکتا۔ ہم بھی کئی دفعہ البرہان میں عرض کر چکے ہیں کہ کاغذی حد تک آئین اور قانون کے بہت سے اجزا اسلامی ہیں لیکن ان پر عمل درآمد کرنے والے ادارے اور ان اداروں کو چلانے والے افراد اپنے آپ پر اسلام نافذ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں لہٰذا اسلامی انقلاب کے نعروں، دھرنوں، جلسے جلوسوں حتیٰ کہ اسلامی قانون پاس کر لینے سے بھی دین کا غلبہ ممکن نہیں ہے جب تک آپ فرد کو نہ بدلیں اور فرد کو بدلنے کے لیے تعلیم و تربیت کے خاموش انقلاب کی ضرورت ہے نہ کہ گلا پھاڑ کر نعرے لگانے کی۔

تبدیلی اور اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو منہاج اپنے بھیجے ہوئے رسولوں اور خصوصاً آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا وہ تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیۂ نفس کے دو اصولوں پر مبنی تھا اور آج بھی انہی اصولوں پر عمل کر کے فرد، معاشرے اور ریاست کی اصلاح و تعمیر ممکن ہے۔ ہم یہ بات حیلے بہانے سے مختلف اسالیب میں اپنے قارئین کے سامنے لاتے رہتے ہیں اور تازہ شمارے میں بھی اس پر ایک مبسوط مقالہ موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے دین کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

منہج غلبۂ دین

ڈاکٹر محمد امین

غلبۂ دین میں دینی سیاسی جماعتوں اور مسلح تنظیموں کی ناکامی
اور دینی مدارس ودعوتی تنظیموں کی محدود اپروچ کے پیشِ نظر

تعمیرِ فرد اور سماجی تبدیلی۔ کرنے کے اہم ترین کام

ہم اس موضوع اور اس کے مختلف پہلوؤں پر مختلف عناوین سے پچھلے پانچ سال سے لکھ رہے ہیں۔ یہ ان سب پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہوئی ایک جامع تحریر ہے جس میں ہم نے 'تعمیر فرد' اور 'سماجی تبدیلی' کی اہمیت، جواز اور لائحہ عمل پر ذرا کھل کر گفتگو کی ہے۔ ہم چاہتے ہیں بلکہ ہماری درخواست ہے کہ البرہان کا ہر قاری ہمیں اس پر اپنا ردِعمل دے بذریعہ خط، ای میل، SMS، فون وغیرہ، خواہ وہ ہماری رائے کے حق میں ہو یا اس کے خلاف۔ جو اصحاب دانش ہماری رائے سے اختلاف رکھتے ہوں وہ اس کے خلاف لکھیں یا ہماری رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے متبادل تجاویز دیں تو ہم انہیں بخوشی البرہان میں شائع کریں گے۔

مقالہ طویل ہوگیا ہے لہٰذا دو قسطوں میں دیا جا رہا ہے۔ مدیر

ہم یہاں جو بات ذرا تفصیل سے کہنا چاہتے ہیں، مناسب ہوگا کہ پہلے ہم اسے مختصر الفاظ میں اجمال سے کہہ دیں تاکہ بات ایک نظر میں سامنے آجائے۔ پھر جو چاہے وہ ہماری وضاحت سے کہی ہوئی بات بھی پڑھ لے۔

۱۔ مسلمانوں کے عروج کا سبب یہ تھا کہ وہ اپنے نظریۂ حیات سے کماحقہ وابستہ ہو گئے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم قرآنی 'یعلمھم الکتاب والحکمة ویزکیھم' کی روشنی میں فرد کی ایسی تعلیم وتربیت کی تھی جس نے انہیں ایسا پارس بنا دیا کہ جو ان سے چھوا سونا بن گیا اور ایک ایسا طوفان بنا دیا جس کی بلاخیر موجوں کے آگے کوئی ٹھہر نہ سکا اور جس کے نتیجے میں انہیں دنیا میں بھی غلبہ اور کامیابی ملی اور ان شاء اللہ آخرت میں بھی ملے گی...... اور اصل کامیابی تو آخرت ہی کی کامیابی ہوتی ہے اور وہی ہر مسلمان کا ترجیحی ہدف ہوتی ہے۔

۲۔ مسلمانوں کے زوال کا سبب یہ تھا کہ اس وابستگی میں بوجوہ کمی آ گئی اور فرد میں وہ صلاحیتیں پیدا ہونی بند ہو گئیں جو آخرت میں کامیابی اور اس دنیا میں ترقی، غلبے اور کامرانی کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔

۳۔مسلمان اس وقت زوال کے گڑھے سے نکلنے کے لیے کوشاں ہیں لیکن ان کو زوال میں دھکیلنے اوراس سے نکلنے نہ دینے میں جو خارجی عنصر مزاحم ہے وہ یورپ وامریکہ کی ملحدانہ فکر وتہذیب اوراس کے علمبردار مغربی ممالک ہیں۔ یہود وہنود اور دیگر اسلام دشمن قوتیں بھی ان کے ساتھ ہیں۔

۴۔مسلمانوں میں دینی مقاصد کے لیے کام کرنے والے (پاکستانی تناظر میں) اس وقت چار بڑے گروہ اور جماعتیں ہیں: ۱۔دعوتی وتبلیغی تحریکیں ۲۔دینی سیاسی جماعتیں ۳۔دینی مدارس ۴۔جہادی گروپ

۵۔ان چاروں گروپوں کی سرگرمیاں مبارک اوران کی کوششیں محمود لیکن ان کے منہج اور لائحہ عمل میں تین ایسے نقص اور خامیاں ہیں جن کی وجہ سے حالات کماحقہ بہتری کی طرف نہیں جارہے:

ایک: یہ لوگ 'یعلمھم الکتاب والحکمۃ ویزکیھم' کے قرآنی حکم اور محمدی اسوہ پر کماحقہ عمل نہیں کررہے جس کے نتیجے میں فرد کی صحیح تعلیم وتربیت نہ ہونے کی وجہ سے قرآن کا وہ مطلوب فرد تیار ہی نہیں ہورہا جو دنیا اورآخرت دونوں میں کامیابی کی صلاحیت رکھتا ہو۔

دوسرے: ان کو مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب کی فتنہ انگیزی اور مسلم امہ اور معاشرے کے لیے اس کے چیلنج کی نوعیت، اہمیت اوراس کے گہرے ضرر ونقصانات کا صحیح اندازہ ہے نہ ادراک اور نہ اس تہذیب کے ہمہ گیر چیلنج (جو فکری اور علمی بھی ہے اور تہذیبی وثقافتی بھی، سیاسی اور قانونی بھی ہے اور معاشی ومعاشرتی بھی، حربی بھی ہے اور سائنسی بھی) سے نمٹنے کے لیے ان کے پاس مناسب حکمت عملی اور لائحہ عمل ہے۔

تیسرے: اوپر ذکر کردہ دونوں چیلنجز سے نمٹنے کے لیے ان کے درمیان اشتراک وتعاون مطلوب ہے جب کہ وہ اس طرح کام کررہے ہیں جیسے ایک دوسرے کے حریف اور دشمن ہوں۔

ہماری اس تحریر کا مقصد یہ ہے کہ ان گروہوں اور جماعتوں کو، ملک کے پڑھے لکھے اور سوچنے سمجھنے والے عناصر کو اور عامۃ المسلمین کو اس نازک صورتِ حال کے فہم وادراک میں مدد دیں تاکہ صحیح رُخ میں عمل کی راہیں کھل سکیں اور ترجیح آخرت کی بنیاد پر ہماری انفرادی اور اجتماعی فلاح کی منزل قریب آسکے۔

۱۔ رجوع الی الاسلام...... ہمارے مسائل کا واحد حل

جو لوگ سمجھتے ہیں کہ ہمارے انفرادی اور اجتماعی مسائل کا حل اسلام کے علاوہ کسی اور نظریے یا کسی اور ازم (جیسے سیکولرزم، سوشلزم وغیرہ) یا فکر وعمل کے کسی اور منہج (جیسے مغربی تہذیب) میں پوشیدہ

ہے وہ بالبداہت غلطی پر ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے قوموں کے عروج وزوال اور ترقی و ناکامی کے اسباب پر کماحقہٗ کبھی غور نہیں کیا یا انہیں کبھی اس کا موقع نہیں ملا۔ ہم نے اس مسئلے پر اپنی کتاب 'مسلم نشاۃ ثانیہ: اساس اور لائحہ عمل' میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، اسے وہاں دیکھا جاسکتا ہے۔ یہاں ہم تلخیصاً عرض کرتے ہیں کہ:

قوموں اور تہذیبوں کے عروج وزوال اور ترقی و ناکامی کا انحصار اس امر پر ہوتا ہے کہ زندگی کے بارے میں جن نظریات پر (خصوصاً انسان کو درپیش تین بنیادی مسائل کے بارے میں کہ یہ کائنات جس میں ہم رہ رہے ہیں اس کی حقیقت ونوعیت کیا ہے؟ اس میں بحیثیت انسان ہمارا کردار کیا ہے؟ اور کیا انسان اور کائنات کا کوئی خالق ہے یا نہیں؟) کوئی معاشرہ یقین رکھتا ہے، افراد معاشرہ ان پر یکسوئی سے عمل پیرا ہیں یا نہیں؟ اگر وہ ہوں گے تو ان میں وہ صلاحیتیں ابھر آئیں گی جو دنیا میں ترقی و کامیابی کے لیے ضروری ہیں اور اگر اس کے برعکس ہوگا تو ان میں وہ صلاحیتیں یا تو پیدا ہی نہ ہوں گی اور پیدا ہو چکی ہوں تو پژمردہ ہو جائیں گی اور ٹھٹھر کر رہ جائیں گی اور وہ قوم رتہذیب زوال کا شکار ہو جائے گی اور ضعف و ناکامی اس کا مقدر ٹھہریں گی۔

i- مسلم تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ ان کے ساتھ ایسا ہی ہوا جب نبی کریم ﷺ نے اپنے مخاطب افراد کی صحیح تعلیم وتربیت کی تو وہ طاقت کا جوار بھاٹا بن کر اٹھے اور ہر مزاحم قوت کو توڑ کر خس وخاشاک کی طرح بہالے جانے میں کامیاب ہو گئے اور تقریباً ایک ہزار سال بعد جب ان کا ایمان کمزور ہو گیا، اپنے نظریۂ حیات سے کماحقہٗ وابستگی ان میں باقی نہ رہی تو ان کی صلاحیتیں ماند پڑ گئیں اور وہ ادبار سے دوچار ہو گئے۔

ii- اس لیے آج مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا واحد صحیح لائحہ عمل یہ ہے کہ مسلم معاشرے کے افراد کی صحیح تعلیم وتزکیے کے ذریعے انہیں ان کے نظریۂ حیات (اسلام) سے محکم طور پر وابستہ کر دیا جائے تاکہ ان میں پھر وہ صلاحیتیں بیدار ہو جائیں جو دنیا و آخرت میں ترقی وکامیابی کے لیے ضروری ہیں اور انہیں قوت وغلبہ حاصل ہو جائے۔

iii- جو لوگ سمجھتے ہیں کہ مغربی تہذیب اور اس کے اداروں (معاشیات میں نظام سرمایہ داری، سیاست میں جمہوریت و وطنیت، مغربی معاشرت وقانونی نظام اور سائنس وٹیکنالوجی وغیرہ) یا کمیونزم و سوشلزم کی پیروی کر کے مسلمان ترقی کر سکتے ہیں وہ ایک غیر عقلی، غیر سائنسی اور غیر منطقی بات کہتے ہیں

کیونکہ مغربی تہذیب ہو یا سوشلزم دونوں اپنی اصل میں اسلام کے ورلڈ ویو اور اس کی تعلیمات کے برعکس ہیں لہٰذا ایک شخص اگر مسلمان ہوتے ہوئے ان غیر اسلامی نظریات میں سے کسی کو اپناتا ہے تو لازمی طور پر اس کا نتیجہ فکری انتشار اور عمل و کردار کے بحران کی صورت میں نکلے گا اور یہ چیز مسلمانوں کو زوال کے گڑھے میں مزید دھنسا دے گی اور ان کے ضعف و کمزوری میں مزید اضافہ کرے گی۔ لہٰذا مسلمان اگر مسلمان رہتے ہوئے ترقی و کامیابی کے خواہاں ہیں تو ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں ہے کہ وہ اچھے مسلمان بن جائیں اور حقیقی معنوں میں اسلام سے وابستہ ہو جائیں۔ جب ایسا ہوگا تو ان کے اندر وہ صلاحیتیں پنپنا شروع ہو جائیں گی جو دنیا و آخرت میں ترقی و کامیابی کے لیے ضروری ہیں۔

بالفرض اگر وہ اسلام کو چھوڑ کر مغربی تہذیب کو پوری طرح اپنا لیں (گو یہ عملاً ممکن نہیں ہے کیونکہ اگر انہوں نے اس وقت اسلام کو نہیں چھوڑا جب استعمار ان پر غالب تھا تو آج وہ کیسے اسلام کو چھوڑ دیں گے) تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ وہ دنیا میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن آخرت میں پھر بھی ناکامی ان کا مقدر ٹھہرے گی کیونکہ جدید مغربی فکر کسی خدا اور آخرت میں سرے سے یقین ہی نہیں رکھتی۔

خلاصہ یہ کہ اگر مسلمان، مسلمان رہتے ہوئے ترقی و کامیابی کی منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں تو یہ ان کی مجبوری ہے کہ وہ اسلام سے صحیح اور حقیقی معنوں میں وابستہ ہو جائیں اور ماسوا اسلام سارے نظریات (خواہ وہ مغربی تہذیب کے ادارے ہوں یا کمیونزم و سوشلزم) سے منہ موڑ کر اسلام پر یکسو ہو جائیں اور اس کے تقاضوں کے مطابق زندگی گزاریں۔

۲۔ بنیادی بات: فرد کے ایمان کی آبیاری

i۔ سطور بالا کی بحث سے دو باتیں واضح ہو گئیں: ایک یہ کہ کسی قوم/ملک/تہذیب کی ترقی و کامیابی میں فرد بنیادی کردار ادا کرتا ہے کیونکہ معاشرہ ہو یا ریاست، قوم ہو یا تہذیب، اجتماعی زندگی کی اساس فرد ہے لہٰذا جب تک فرد کی اصلاح نہیں ہوگی تو معاشرے اور ریاست کی اصلاح بھی نہ ہو سکے گی اور جب تک فرد اپنے نظریۂ حیات پر یکسو نہ ہو اور اس کے ساتھ محکم وابستگی نہ رکھتا ہو، اس میں وہ صلاحیتیں پیدا ہو ہی نہیں سکتیں جو کسی قوم یا ریاست کی ترقی کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔

دوسرے یہ کہ وہ نظریہ، وہ ورلڈ ویو اور وہ عقیدہ اہم تر ہے جس پر فرد یقین رکھتا ہے کیونکہ جب تک فرد اس نظریے یا عقیدے پر یکسو نہیں ہوگا، اس کی شخصیت کی تعمیر اور کردار کی نمو ہو ہی نہیں سکتی۔ گویا دو

چیزیں اہم ہیں ایک یہ کہ یہ نظریہ/عقیدہ صحیح ہو اور دوسرے یہ کہ فرد اس پر یکسو ہو اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کا محکم عزم رکھتا ہو۔

مسلمانوں کی اصطلاح میں عقیدے کو ماننے کے عمل میں جو چیز حاصل ہوتی ہے اسے ایمان کہتے ہیں گو یا فرد کی قوت ایمان کے مضبوط ہونے میں ہے۔ جتنا ایمان مضبوط ہوگا اتنا ہی وہ محرک عمل ہوگا اور انسانی فکر عمل میں ڈھلتی چلی جائے گی اور اگر ایمان کمزور ہوگا تو منطقی طور پر فرد کا عمل بھی ناقص اور کمزور ہوگا۔ اور چونکہ معاشرہ اور ریاست افراد ہی کے مجموعے کا نام ہے لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ معاشرے کی مضبوطی اور ریاست کے استحکام اور ان کے قوی ہونے کا انحصار فرد کے ایمان کی مضبوطی پر ہے جو فرد کے عمل کی بنیاد ہے۔ لہٰذا معاشرے اور ریاست کی ترقی و کامیابی کی بنیاد فرد ہے اور فرد کی قوت کا منبع اس کا ایمان ہے۔ اور اس کے ایمان کی مضبوطی ہی اس کے عمل و کردار کی اساس ہے۔ لہٰذا اگر ہم معاشرے اور ریاست کے استحکام اور قوت کے خواہاں ہیں تو اس کا حل یہ ہے کہ فرد کے ایمان کی آبیاری کریں، اس کے ایمان کو مضبوط بنائیں، تاکہ یہ ایمان عمل میں ڈھل سکے اور ایک باعمل مسلم شخصیت جنم لے سکے اور ایسے افراد کے اجتماع سے ایک مضبوط معاشرہ اور کامیاب ریاست جنم لے سکے۔ یہی وہ طریقہ ہے جس پر عمل کر کے نبی کریم ﷺ نے ایسے مسلم معاشرے اور ریاست کی بنیاد رکھی جس کی قوت کے آگے، خلافت راشدہ کے دور میں، اٹھارہ بیس سالوں کے اندر دنیا کی دو سپر پاورز مسلمانوں کے قدموں میں تھیں۔

ii- اس سے اگلا سوال خود بخود یہ پیدا ہوتا ہے کہ فرد کے ایمان کی آبیاری اور اس کے ایمان کی مضبوطی کیسے ممکن ہے یا اس کے ممکنہ ذرائع کون سے ہیں؟ اس کا جواب ہمیں قرآن دیتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ سارے انبیاء اور خصوصاً آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ کو ایسے افراد کی تیاری کا جو لائحہ عمل دیا گیا تھا وہ مختصر الفاظ میں دو نکات پر مشتمل تھا: ایک تعلیم کتاب وحکمت اور دوسرے تزکیۂ نفس۔ تعلیم کتاب تو واضح ہے کہ قرآن حکیم مسلمانوں کے نصاب تعلیم کی بنیاد اور محور ہونا چاہیے اور تعلیم حکمت سے مراد یہ ہے کہ وہ اکتسابی علوم (یعنی عمرانی اور سائنسی علوم) جو معاشرے کو درکار ہوتے ہیں وہ بھی قرآن حکیم کی تعلیمات کے مطابق ہونے چاہئیں اور تزکیۂ نفس سے مراد یہ ہے کہ یہ تعلیم طلبہ کو اس طرح دی جائے کہ ان کی تربیت بھی ساتھ ساتھ ہوتی جائے تاکہ قرآن حکیم اور اس کے تحت دیگر عقلی علوم کی تعلیم جب طلبہ مکمل کریں تو ان کے پاس محض قرآن اور اس کے تبعی علوم کا علم ہی نہ ہو بلکہ وہ اس کے تقاضوں پر خوش دلی سے عمل پیرا بھی ہوں اور اس طرح ان کے فکر و عمل کی دنیا آباد ہوتی چلی جائے۔

مسلم روایت اور شرعی اصطلاحات کے مطابق تعلیم وتربیت کے اس منہاج کے لیے دعوت وتبلیغ، اصلاح، تزکیۂ نفس، امر بالمعروف ونہی عن المنکر جیسی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔ اس کے لیے مدارس وجامعات اور خانقاہیں وجود میں آئی ہیں اور مرور زمانہ کے ساتھ اور ناموں کے تغیر وتبدل کے ساتھ یہ ادارے آج بھی مسلم دنیا میں موجود ہیں۔ مدارس آج کل سکول، کالج اور یونیورسٹیاں کہلاتے ہیں اور غیر رسمی تعلیم میں الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کا کردار بہت اہمیت اختیار کر گیا ہے۔

۳۔ مغربی تہذیب کا فتنہ اور چیلنج

مغربی تہذیب کی نوعیت

انسان جب سے اس دنیا میں آیا ہے جب وہ سن شعور کو پہنچتا ہے تو اس کے سامنے یہ سوالات آ کھڑے ہوتے ہیں کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اسے زندگی کیسے گزارنی چاہیے؟ اور انسان چونکہ مدنی الطبع ہے اکیلا نہیں رہتا بلکہ مل جل کر، معاشرہ بنا کر رہتا ہے لہٰذا وہ یوں سوچتا ہے کہ اسے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کن اصولوں کے مطابق گزارنی چاہیے؟ انسانی تاریخ بتاتی ہے کہ انسان نے ان سوالوں کے جو جوابات دیے ہیں وہ بنیادی طور پر دو قسم کے ہیں: ایک گروہ انسانی کا خیال ہے کہ اسے ایک بالاتر ہستی (اللہ) نے پیدا کیا ہے لہٰذا اسے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اللہ کی ہدایت کے مطابق گزارنی چاہیے۔ انسانی سلوک (Behavior) دو چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے ایک فکر اور دوسرے عمل۔ چنانچہ یہ گروہ اپنی اصطلاح میں انسانی سوچ اور فکر سے متعلق الٰہی رہنمائی کو 'عقیدہ' اور انفرادی اور اجتماعی اعمال میں اللہ کی رہنمائی کو 'شریعت' کہتا ہے اور دونوں مل کر 'دین' کہلاتے ہیں۔ دوسرا انسانی گروہ وہ ہے جو یہ سوچتا ہے کہ انسان خود شعور وعقل اور بصری وسمعی صلاحیتیں رکھتا ہے لہٰذا انسانی عقل اور اس کا تجربہ ومشاہدہ اسے انفرادی اور اجتماعی زندگی گزارنے کی راہ سجھاتا ہے۔ اس کی اصطلاح میں فکری پہلو 'ورلڈ ویو' اور انفرادی اور اجتماعی زندگی گزارنے کا عمل 'تہذیب' کہلاتا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ عقیدہ اور ورلڈ ویو دراصل ایک ہی چیز ہیں اور دونوں انسانی اعمال کی فکری بنیادوں کی نمائندگی کرتے ہیں اور اسی طرح شریعت/دین اور تہذیب ایک ہی چیز ہیں کیونکہ دونوں انسان کے انفرادی واجتماعی سلوک کی نمائندگی کرتے ہیں اور ان میں فرق صرف تسمیات کا ہے۔ انسانی فکر وعمل کا منبع اگر وحی الٰہی ہو تو وہ عقیدہ وشریعت/دین کہلاتا ہے اور انسانی فکر وعمل کا منبع اگر خود انسانی عقل وشعور اور اس کا تجربہ ومشاہدہ ہو تو یہ 'ورلڈ ویو' اور 'تہذیب' کہلاتا ہے۔ اصطلاحات وتسمیات سے قطع

نظر فنکشن دونوں کا ایک ہی ہے یعنی انسانی فکر وعمل کی رہنمائی۔

پہلا گروہ چونکہ اللہ کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کرتا ہے لہٰذا اس کے رویے کو 'اسلام' اور خود اسے 'مسلم' کہا جاتا ہے اور جو لوگ اس طرز عمل کو نہیں مانتے ان کو 'غیر مسلم' (اللہ کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم نہ کرنے والا) اور 'کافر' (حق کا انکار کرنے والا) کہا جاتا ہے۔ ان دونوں گروہوں کے فکر وعمل میں تھوڑی بہت مشابہت ہوسکتی ہے لیکن اپنی اصل میں مختلف ہونے کی وجہ سے دونوں کے فکر وعمل میں اختلاف و تضاد نمایاں ہوتا ہے۔ پیشتر اس کے کہ ہم ان دونوں گروہوں کے طرز عمل اور نظام ہائے حیات کے اختلاف وتضاد کا تجزیہ کریں، مناسب محسوس ہوتا ہے کہ پہلے ہم ان کی فکر کا تقابلی مطالعہ کر لیں۔ پہلے گروہ کی عصر حاضر میں نمائندگی 'اسلام' اور 'مسلمان' کرتے ہیں اور دوسرے گروہ کی سب سے بڑی نمائندہ مغربی تہذیب اور اس کا ورلڈ ویو ہے۔

مسلم عقیدے کے بنیادی نکات

مسلمانوں کے عقیدے کی اساس تین نکات ہیں: توحید، رسالت اور آخرت۔

توحید: یہ ہے کہ صرف ایک اللہ انسان اور اس کائنات کا خالق و مالک و معبود و پروردگار ہے، اسے زندگی اور موت دینے والا اور اس کے نفع ونقصان پر قادر ہے۔ وہ سب کچھ دیکھتا، سنتا اور سمجھتا ہے۔ **رسالت:** یہ ہے کہ انسان اللہ کا عبد ہے اور اللہ انسان کو یہ سکھانے کے لیے کہ وہ اس کی عبادت و اطاعت کی زندگی کیسے گزارے، خود انسانوں ہی میں سے کسی ایک کو منتخب کر کے اسے براہ راست اپنی ہدایت سے نوازتا ہے اور لوگوں کے لیے بطور ماڈل اور نمونہ بنا کر پیش کرتا ہے تا کہ اسے دیکھ کر وہ اللہ کی مرضی کے مطابق زندگی گزار سکیں۔ **آخرت** کا تصور یہ ہے کہ یہ دنیا عارضی اور دارالامتحان ہے۔ اس دنیا کے بعد ایک اور غیر فانی عالم ہوگا جس میں دنیا کی زندگی کے اچھے یا برے اعمال کی جزا و سزا دی جائے گی۔ جنہوں نے دنیا کی زندگی اللہ کی عبادت واطاعت میں گزاری ہوگی اللہ ان سے راضی ہوگا اور انہیں اپنی نعمتوں سے نوازے گا اور جنہوں نے دنیا کی زندگی اس کے برعکس گزاری ہوگی ان سے وہ ناراض ہوگا اور وہ سخت عذاب کے مستحق ٹھہریں گے۔

مغربی تہذیب کی فکری اساسات

چونکہ مغربی تہذیب آسمانی ہدایت پر یقین نہیں رکھتی اس لیے اس تہذیب کی فکری اساسات ان

تحریکوں کی مرہون منت ہیں جوان کے فلسفیوں اور دانشوروں نے ان کے معاشروں میں برپا کیں۔ اہل مغرب اپنی تہذیب کے بنیادی افکار یا اپنے اس دین کے عقائد (اگرچہ یہ تہذیب اپنے لیے دین یا مذہب کا لفظ استعمال نہیں کرتی کیونکہ ان لوگوں نے بڑی جدوجہد سے پوپ گردی سے نجات پائی تھی جو دینِ آسمانی کے نام پر ان کا صدیوں سے سیاسی، معاشی اور معاشرتی استحصال کررہے تھے؛ اور مذہب کے ساتھ آسمانی ہدایت کا تصور چسپاں ہے جب کہ وہ اس کے منکر تھے) کی جگہ ورلڈ ویو کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور اس میں اپنے تصور انسان، تصور کائنات اور تصور الٰہ کو زیر بحث لاتے ہیں۔

ان افکار کا اگر ہم مطالعہ کریں تو انہیں اسلامی عقائد کے برعکس اور ان سے متضاد پاتے ہیں لیکن بدقسمتی سے مسلم معاشروں میں مطالعۂ مغرب کی روایت جڑ نہیں پکڑ سکی اور ہماری یونیورسٹیوں اور دینی مدارس میں اس کی تدریس کا کوئی انتظام نہیں اور نہ ہمارے تحقیقی اداروں میں مغربی علوم و سٹڈیز کے تجزیے و تحقیق کا کوئی اہتمام ہے (ہماری ذہنی غلامی، نالائقی اور بے حسی کے علاوہ ممکن ہے اس کے پیچھے مغرب کی خواہش اور سازش بھی کارفرما ہو) جس کا نتیجہ یہ ہے کہ سارے عالم اسلام میں ایک بھی 'مرکز برائے مطالعہ مغرب' موجود نہیں۔ بہرحال، ہم یہ کہنا چاہتے تھے کہ مغربی تہذیب کے بنیادی افکار، جنہوں نے اس تہذیب کی تشکیل وصورت گری کی ہے، ان کے تین بڑے منابع ومصادر ہیں: **ایک** مغرب کے بڑے مفکرین ودانشوروں کے حالات وافکار کا مطالعہ جیسے بیکن، کانٹ، نٹشے، ہیگل، روسو، ڈارون، فرائیڈ وغیرہ۔ **دوسرے** مغرب کی اہم فکری تحریکوں کا مطالعہ جیسے تحریک نشأۃ ثانیہ (Renaissance)، تحریک اصلاح مذہب (Reformation)، تحریک تنویر یا تحریک روشن خیالی (Enlightenment)، تحریک جدیدیت (Modernity) اور تحریک پس جدیدیت (Post-Modernity) وغیرہ۔ **تیسرے** مذکورہ فلاسفہ/دانشوروں اور فکری تحریکوں کے پیدا کردہ اہم نظریات جیسے ہیومنزم (Humanism)، سیکولرزم (Secularism)، کیپٹل ازم (Capitalism) سائنٹزم (Scienticism)، لبرلزم (Liberalism)، میٹریل ازم (Materialism) وغیرہ۔ مغربی زبانوں، خصوصاً انگریزی میں، مغربی تہذیب کے ان مصادر پر بلاشبہ کروڑوں کتابیں، لاکھوں جرائد، ہزاروں ویب سائٹس اور سیکڑوں انسائیکلو پیڈیاز موجود ہیں۔ معلومات کے اس سمندر سے چند مچھلیاں پکڑنا کارے دارد ہے۔ ہم نے قارئین کی سہولت کے لیے اپنی کتاب 'اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش' میں مطالعۂ مغرب کے لیے انگریزی اور اردو کتابیات کی ایک فہرست مہیا کی ہے جس میں غیر مسلم اور مسلم مفکرین کی اہم کتابیں شامل ہیں۔ البرہان نے بھی اپنی زندگی

کے پہلے چار سالوں (۲۰۱۰ء تا ۲۰۱۴ء) میں اس موضوع پر وقیع مضامین شائع کیے ہیں۔ یہاں ہم اختصار کی خاطر مغربی تہذیب کے فکری منابع میں سے اس کے چند اہم نظریات کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کریں گے:

ہیومنزم: جس کا ترجمہ'انسان پرستی' کیا جاسکتا ہے، کا آغاز سولہویں صدی میں تحریک نشاۃ ثانیہ سے ہوا جس کی ابتداء احیائے علوم قدیمہ (فلسفہ یونانیہ ورومیہ) اور اس تصور سے ہوئی کہ انسان اس کائنات میں مرکزی اور اہم ترین حیثیت رکھتا ہے اور جس کی انتہا اس پر ہوئی کہ بقول نیٹشے، خدا مر چکا ہے، اور بقول سارتر'خدا ایک عفریت ہے جسے ہم زندہ نہیں ہونے دیں گے کیونکہ ہم نے انسان کی مکمل آزادی اور خودمختاری کا ہدف بڑی مشکلوں سے حاصل کیا ہے۔ یوں ہیومنزم نے خدا کی بجائے انسان کو اپنا خدا خود بنا دیا ہے اور اسے خودمختار ہی نہیں بلکہ مختار مطلق بنا کر دم لیا ہے۔

لبرلزم اسی ہیومنزم کی پیداوار ہے کہ انسان آزاد اور خودمختار ہے جو چاہے سوچے، جس خیال کا چاہے اظہار کرے (خدا، پیغمبروں اور مقدس کتابوں کی توہین کا حق، فحاشی، عریانی اور بے دینی پھیلانے کا حق)، وہ سیاسی معنوں میں حاکم اعلیٰ (Sovereign) ہے لہٰذا عوام جس کو چاہیں اپنا نمائندہ بنائیں اور جو قانون اس کے نمائندے چاہیں بنائیں (چنانچہ مغرب کی پارلیمنٹیں شراب نوشی، جوئے، زنا، ہم جنسی وغیرہ کو حلال اور قانونی قرار دے چکی ہیں) معاشرتی لحاظ سے جو چاہیں پہنیں اور جو چاہیں اتار دیں، جس کے ساتھ چاہیں نکاح کیے بغیر زندگی گزاریں، حرام کے بچے پیدا کریں اور......اور)

سیکولرزم: ہیومنزم جس معاشرے میں ابھرا بہرحال وہ ایک روایتی عیسائی معاشرہ تھا چنانچہ ہیومنزم سے خدا، وحی اور مذہب کی جو نفی ہوتی تھی اس نے معاشرے میں ارتعاش پیدا کیا تو سیکولرزم کا نظریہ سامنے لایا گیا جس کا مطلب یہ ہے کہ جس کسی نے اللہ اور مذہب کو ماننا ہے وہ اپنی ذاتی زندگی میں مان لے لیکن معاشرے اور ریاست کی اجتماعی زندگی میں بہرحال خدا اور مذہب کا کوئی کردار تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ اس طرح خدا اور مذہب کو ذاتی زندگی کے ایک محدود دائرے میں دھکیل کر غیر موثر کر دیا گیا اور معاشرے وریاست کی اجتماعی زندگی کے سارے شعبوں میں انسانی خدائی کا ڈنکا بجا دیا گیا۔

اگرچہ سیکولرزم بظاہر خدا اور مذہب کا انکار نہیں کرتا لیکن مسلمان ادیب اور دانشور اس لیے اس کا ترجمہ'لادینیت' کرتے ہیں کہ جب انسان نے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ خدا کا اختیار کہاں تسلیم کرے اور کہاں تسلیم نہ کرے تو دین کہاں رہا؟ کیونکہ اسلام تو نام ہی اللہ ہی کی غیر مشروط اطاعت کا ہے اور جب اللہ کی اطاعت ہی انسانی مرضی سے مشروط ہوگئی تو کہاں کا دین اور کہاں کا اسلام؟

کیپٹل ازم: کا ترجمہ اردو میں نظام سرمایہ داری سے کیا جاتا ہے اور اسے بالعموم ایک معاشی نظام سمجھا جاتا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ محض ایک معاشی نظام نہیں بلکہ ایک پورا نظام فکر اور نظام زندگی ہے۔ اس نظریے کی رو سے دنیا ہی سب کچھ ہے۔ یہی خدا ہے اور یہی معیار حق اور معیارِ عزت ہے۔ اسی کے لیے انسان کو ساری تگ ودو کرنی چاہیے۔ حبّ دنیا، حب جاہ ومال اور ہر قیمت پر جمع مال کی حرص وہوس اس نظریے کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہاں تک کہ کیپٹل ازم تقاضا کرتا ہے کہ حکومت کو بھی اس کے افعال میں مداخلت کا حق نہیں (۱) بس پیسہ آنا چاہیے، جہاں سے بھی آئے، جیسے بھی آئے۔ نہ حلال کی طلب، نہ حرام کا فرق۔ سود حلال، سٹہ جائز اور معیار زندگی ہر قیمت پر بلند ہونا چاہیے۔ راتوں رات امیر بننے کی خواہش بری ہے اور نہ دوسروں کو دھکا دے کر، گرا کر، آگے بڑھنا مذموم ہے۔ بس دنیا کی سہولتیں، آسائشیں، کار، کوٹھی، بنک بیلنس...... یہی زندگی میں مطلوب ہے اور اسی کی قدر ووقعت ہے۔ نہ اس میں آخرت کی ترجیح کی کوئی صورت ہے اور نہ اخلاقی اصول وضوابط کی اور نہ الٰہی ہدایت کی۔

سائنٹسزم: سائنٹسزم یا ایمپریسزم کا مطلب یہ ہے کہ جب انسان خودمختار ہے تو اپنی عقل استعمال کر کے وہ اپنے سارے مسائل خود حل کر سکتا ہے۔ اسے خدا، وحی اور مذہب کی رہنمائی کی ضرورت نہیں۔ حقیقی علم وہ ہے جو انسان کو تجربے اور مشاہدے کے نتیجے میں حاصل ہو کیونکہ لیبارٹری میں اس کو دہرا کر اس کے نتائج کا تجربہ کیا جا سکتا ہے اور اسے صحیح یا غلط ثابت کیا جا سکتا ہے (۲) جب کہ مذہبی عقائد تو خدا کے جبر کی وجہ سے ماننے پڑتے ہیں۔ اسی لیے انہیں Dogma کہا جاتا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں اس نظریہ نے سائنس اور ٹیکنالوجی کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا اور سائنسی منہاج علم کو مذہبی اور عمرانی علوم کے شعبوں پر بھی حاوی کر دیا۔

مسلمان بجا طور پر اس نظریے کو انکارِ وحی کے مترادف مانتے ہیں کیونکہ یہ منہاج وحی کی صداقت کو بھی اپنے ترازو میں تولتا اور اسے رد کرتا ہے اور الٰہی ہدایت کی برتری کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ مغرب کے فلسفۂ تعلیم (Epistemology) پر اس نظریے نے خاطر خواہ اثرات ڈالے ہیں اور سائنسی منہاج کو علم حقیقی کا منبع قرار دے کر اس نے مذہب اور عمرانی علم پر بھی اسے غالب کر دیا ہے۔

مغرب کا ورلڈ ویو: ان افکار سے مغربی تہذیب کے علم برداروں کا ورلڈ ویو واضح ہو جاتا ہے ان کے نزدیک تصور انسان یہ ہے کہ انسان خودمختار بلکہ مختار مطلق ہے، وہ اپنے بارے میں اور اپنی اجتماعی زندگی کے بارے میں جو فیصلے چاہے کر سکتا ہے گویا وہ اپنا خدا خود ہے اور کسی خدا کا عبد نہیں ہے۔ ان کا تصور الٰہ اور مذہب یہ ہے کہ اگر کوئی اپنی ذاتی زندگی میں خدا کو ماننا چاہتا ہے تو مان لے لیکن اجتماعی زندگی

میں اس خدا کی کوئی بات نہیں مانی جائے گی اور یہاں عوام کی رائے ہی فیصلہ کن ہوگی۔ گویا یہ فیصلہ کرنا فرد (یعنی عوام) کی اتھارٹی ہے کہ وہ خدا کی کون سی بات مانے اور کون سی نہ مانے۔ اسی طرح ان کا تصور کائنات یہ ہے کہ زندگی بس اس دنیا ہی کی زندگی ہے، یہی اہم ہے اور یہی ہماری تگ وتاز کا ہدف ہونی چاہیے۔ اسی کی بہتری اور یہاں سہولتوں اور آسائشوں کا حصول ہی ہماری ساری کوششوں کا مرکز ہونا چاہیے، رہی آخرت تو وہ کس نے دیکھی ہے۔ اسی طرح یہ تہذیب وحی اور آسمانی ہدایت کے منبع علم ہونے کا انکار کرتی ہے۔ اس کے نزدیک حق اور حقیقی علم صرف وہ ہے جو انسانی عقل اور تجربہ ومشاہدہ کی پیداوار ہو اور جس کے صحیح ہونے کا ثبوت معمل (لیبارٹری) میں دیا جا سکتا ہو۔

اس ورلڈ ویو کا خلاصہ یہ ہے: خدا اور اس کی کبریائی کا انکار، انسان کا خدا کا عبد نہ ہونا بلکہ اپنے فیصلے کرنے میں خودمختار ہونا۔ دنیا ہی کو سب کچھ سمجھنا اور اسے آخرت پر ترجیح دینا۔ رسالت، وحی اور الٰہی ہدایت کا انکار اور عقل وحواس سے حاصل ہونے والے علم کو حتمی معیار سمجھنا۔

مغربی تہذیب: ایک نظامِ حیات

ان افکار نے عملی زندگی میں جن اجتماعی اداروں اور رویوں کو جنم دیا ہے ان میں سے چند اہم یہ ہیں:

معاشرت: فرد کی لامحدود آزادی۔ عورت اور مرد کی مساوات، عورت کو حق نکاح اور حق طلاق بلکہ بغیر نکاح کے مرد کے ساتھ رہنے اور بچے پیدا کرنے کی آزادی۔ لباس کی آزادی کہ جو چاہے پہنے اور نہ چاہے تو نہ پہنے، ہم جنسیت کی آزادی، محارم اور جانوروں کے ساتھ بھی زنا کی آزادی۔ بزرگوں کی تکریم کا خاتمہ اور ان کی اولڈ ہومز میں رہائش۔ عورتوں کی بچے پیدا کرنے اور پالنے میں مزاحمت۔ خاندان کی ٹوٹ پھوٹ بلکہ خاتمہ۔

سیاست: حاکمیت اعلیٰ (Sovereignty): فرد اور عوام حاکم اعلیٰ ہیں نہ کہ خدا اور اس کا قانون۔

جمہوریت: فرد چونکہ خودمختار ہے لہٰذا اس کے نمائندے بھی خودمختار ہیں اور پارلیمنٹ سب پر بالادست ہے۔ حلال وحرام کا فیصلہ خود کر سکتی ہے اور جو قانون چاہے بنا سکتی ہے۔ چنانچہ مغرب میں شراب نوشی، جوا، زنا، ہم جنسیت سب جائز اور قانونی ہیں۔ انسانوں کا بنایا ہوا آئین مقدس ہے۔

نیشنلزم: قومیت کی بنیاد نسل، زبان، رنگ اور خطے کا اشتراک ہے۔ وطن مقدس ہے اور معیار حق و

باطل ہے۔ اسی کی خاطر جنگیں لڑی جاتی ہیں اور اس کے مفاد پر سب کچھ قربان کیا جا سکتا ہے یہاں تک کہ عزت اور اخلاق بھی۔

معیشت: چونکہ دنیا ہی سب کچھ ہے لہٰذا ہر قیمت پر یہاں کی کامیابی اور خوشحالی مطلوب ہے لہٰذا حب دنیا اور حب جاہ و مال محمود ہے۔ سود لینے دینے میں کوئی قباحت نہیں۔ لامحدود منافع اندوزی تجارت کا ہدف ہے یہاں تک کہ حکومت کو بھی اس میں مداخلت کی اجازت نہیں۔ معیارِ زندگی بلند کرنے کی دوڑ ضروری ہے اور راتوں رات امیر بننے کی خواہش میں کوئی برائی نہیں۔

قانون: اپنے لیے قانون بنانا انسانوں کا حق ہے۔ خدا کے قانون کی کوئی حیثیت نہیں لہٰذا آئین مملکت اور قانون پارلیمنٹ بناتی ہے جسے چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔

طوالت سے بچنے کی خاطر ہم ان چند شعبہ ہائے حیات کے مختصر ذکر پر کفایت کرتے ہیں۔

مغربی تہذیب دین غیر اللہ ہے

مغربی تہذیب کے ان اساسی افکار سے واضح ہے کہ اس تہذیب کا ورلڈ ویو اسلامی عقائد سے متضاد ہے اور اس ورلڈ ویو کی بنیاد پر اجتماعی زندگی (یعنی معاشرت، معیشت، سیاست، قانون......وغیرہ کے شعبوں) میں جو ادارے مغربی تہذیب کے علمبردار ممالک نے بنائے ہیں، وہ اسلامی تعلیمات و احکام کے نقیض، مخالف اور ان سے متضاد ہیں۔ لہٰذا مسلمان مجبور ہیں کہ اسے دین غیر اللہ سمجھیں اور رد کریں کیونکہ انہیں یہی حکم دیا گیا ہے:

- ''اور جو کوئی دین اسلام کو چھوڑ کر کوئی اور دین اختیار کرتا ہے تو اللہ اس کے دین کو ہرگز قبول نہ کرے گا اور وہ آخرت میں گھاٹے میں رہے گا۔'' (آل عمران، ۳:۸۵)

- ''تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں، مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لیے طاغوت کی طرف رجوع کریں حالانکہ انہیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ شیطان انہیں بھٹکا کر راہ راست سے بہت دور لے جانا چاہتا ہے۔'' (النساء ۴:۶۰)

- ''ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا اور اس کے ذریعہ سے سب کو خبردار کر دیا کہ 'اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو، اس کے بعد ان میں سے کسی کو اللہ نے ہدایت بخشی اور کسی پر ضلالت مسلط ہو گئی۔ پھر ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔'' (النحل ۱۶:۳۶)

- ''جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں وہی کافر ہیں...... وہی ظالم ہیں...... وہی فاسق ہیں۔'' (المائدہ ۵: ۴۴۔۴۷)

- ''پس (اے نبی اور نبی کے پیروؤ) یک سو ہو کر اپنا رُخ اس دین کی سمت میں جما دو اور قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی بنائی ہوئی انسانی فطرت بدلی نہیں جا سکتی، یہی بالکل راست اور درست دین ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔'' (الروم ۳۰: ۳۰)

- ''اے نبی، کہہ دو کہ 'لوگو! اگر تم ابھی تک میرے دین کے متعلق کسی شک میں ہو تو سن لو کہ تم اللہ کے سوا جن کی بندگی کرتے ہو میں ان کی بندگی نہیں کرتا بلکہ صرف اسی خدا کی بندگی کرتا ہوں جس کے قبضے میں تمہاری موت ہے۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ایمان لانے والوں میں سے ہوں اور یکسو ہو کر اپنے آپ کو ٹھیک اس دین پر قائم کر دوں، اور ہرگز ہرگز مشرکوں میں سے نہ ہوں۔'' (یونس ۱۰: ۱۰۴، ۱۰۵)

مغربی تہذیب کو ردّ کرنے کے مزید دلائل

اگرچہ مغربی تہذیب کو ردّ کرنے کے لیے ایک مسلمان کے لیے مندرجہ بالا بنیادی بات ہی کافی ہے کہ یہ کفر ہے، دین غیر اللہ ہے اور کسی مسلمان کے لیے بحالتِ ایمان یہ جائز نہیں کہ وہ اسلام کو چھوڑ کر اس کی الحادی فکر کو مانے اور اس کی خلاف اسلام تعلیمات پر عمل کرے۔ تاہم اس کے علاوہ بھی کئی اور اسباب اور وجوہ ایسی ہیں جو تقاضا کرتی ہیں کہ مسلمان مغربی فکر و تہذیب کو ردّ کر دیں مثلاً:

۱۔ قرآن وسنت کی تعلیمات

جو قومیں اس الحادی مغربی فکر و تہذیب کی پیرو ہیں ان کی اکثریت یہود و نصاریٰ پر مشتمل ہے۔ یہ اپنے مذہب کی تعلیمات پر عمل کریں یا نہ کریں، اس کے لیے شدید تعصب ضرور رکھتی ہیں اور مسلمانوں کو اپنا حریف اور دشمن سمجھ کر ان سے نفرت و انتقام کے جذبات ہمیشہ سے رکھتی رہی ہیں۔ چنانچہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو ان سے دور رہنے اور ان کی سازشوں سے بچنے کی شدید تلقین کی ہے۔ اس ضمن میں چند آیات و احادیث درج ذیل ہیں:

- ''یہودی اور عیسائی اس وقت تک تم سے راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کا مذہب نہ اختیار کر لو۔ ان سے کہو کہ اللہ کی ہدایت ہی سچی ہدایت ہے اور اگر تم اللہ کی طرف سے صحیح علم آ جانے کے بعد بھی ان کی خواہشوں کے پیچھے چلو گے تو اللہ کے مقابلے میں تمہارا نہ کوئی حمایتی ہو گا اور نہ کوئی

مددگار۔''(البقرہ۲:۱۲۰)

۔ ''اے ایمان والوغیر مسلموں کو(یعنی یہودیوں اورعیسائیوں کو، کیونکہ سابقہ آیات میں انہی کا ذکر ہے)اپنا راز دار نہ بناؤ۔ وہ تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کمی نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ تم مشکل میں پڑو۔ان کی دشمنی ان کی باتوں سے ظاہر ہے اور جو بغض تمہارے لیے ان کے دلوں میں ہے وہ اس سے بھی زیادہ ہے۔تم ان سے دوستی رکھتے ہو مگر وہ تم سے دوستی نہیں رکھتے۔ جب وہ تم سے الگ ہو کر آپس میں ملتے ہیں تو تمہارے خلاف غصے سے اپنی انگلیاں چباتے ہیں۔ اگر تمہارے حالات اچھے ہوں تو انہیں رنج ہوتا ہے اور اگر تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔اگر تم صبر سے کام لو اور تقویٰ اختیار کرو تو ان کی سازشیں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی۔''(آل عمران ۳:۱۱۸۔۱۲۰)

۔ ''اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست نہ بناؤ۔ وہ (صرف) ایک دوسرے کے دوست ہیں۔تم میں سے جو انہیں دوست بنائے گا وہ انہی میں شمار ہوگا۔ بے شک اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔''(المائدہ۵:۵۱)

احادیث

۔ 'خالفوا الیھود والنصاری'(۱) یہود ونصاری کی مخالفت کرو۔ [یہ الفاظ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت سارے احکام کے سلسلے میں بطور اصول ارشاد فرمائے]۔

۔ 'لاتستضیؤا بنار المشرکین'(۲) یعنی مشرکوں کی آگ سے آگ نہ جلاؤ[مطلب یہ کہ ان سے معاشرتی تعلقات نہ رکھو، ان کے قریب نہ رہو، ان کی محتاجی سے بچو]

۔ 'غیر المغضوب علیھم ولاالضالین' کی تفسیر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اس سے مراد یہود ونصاریٰ ہیں(۳)[گویا ہم مسلمانوں کو حکم ہے کہ نماز کی ہر رکعت میں اللہ سے دعا مانگیں کہ اے اللہ ہمیں یہود ونصاریٰ کی پیروی سے بچا]

۲۔اہل مغرب کا رویہ اسلام اور مسلمانوں سے عملاً دشمنی کا ہے

یہود ونصاریٰ میں اسلام و مسلم دشمنی کی جڑیں بہت گہری ہیں۔عہد نبوی میں یہودیوں نے اسلام اور مسلمانوں کو ناکام کرنے کے لیے ہر طرح کی سازشیں کیں جن کے نتیجے میں وہ مدینہ سے نکالے گئے۔ اس کے باوجود وہ باز نہ آئے تو خیبر میں کچلے گئے۔نصاری کے حملوں کی ابتداء غزوۂ تبوک وموتہ میں ہوگئی تھی۔صحابہ کرام نے ان کا پھن کچلا لیکن یہ بِس گھولتا رہا۔ یہاں تک کہ ۱۴۵۳ء میں جب قسطنطنیہ فتح

ہوا تو عیسائی رہنما پورے یورپ میں پھیل گئے اور مسلمانوں کے خلاف نفرت وانتقام کے شعلے بلند کرنے شروع کیے۔ صلیبی جنگیں بھی اسی کا مظہر تھیں بلکہ مغربی تہذیب کی نشأۃ ثانیہ میں یہی جذبہ محرکہ کارفرما تھا جس کا

---

۱) مسند احمد بن حنبل، ج ۵ ص ۲۶۴، ۲۶۵

۲) سنن نسائی، کتاب الزینۃ، باب لا تنقشوا علی خواتیمکم عربیاً

۳) سنن ترمذی، ابواب تفسیر القرآن، باب ومن سورۃ فاتحہ الکتاب

اظہار اس سے ہوتا ہے کہ پہلی جنگ عظیم میں جب اتحادیوں نے فتح پائی اور مشرق وسطی کو فتح کر کے اس پر قبضہ کرلیا تو عیسائی اتحادی کمانڈر نے دمشق میں سلطان صلاح الدین ایوبی کی قبر کو ٹھڈے مارتے ہوئے کہا کہ اٹھو صلاح الدین! ہم آ گئے ہیں۔

اور ہمارے عہد میں، ہماری آنکھوں دیکھتے اور کانوں سنتے جو کچھ ہوا (اس کا انکار کون کرسکتا ہے سوائے اس کے جس کی آنکھوں پر مغربی فکر وتہذیب کی فکری غلامی کی پٹی بندھی ہو اور جس کے کان حق بات سننے کی صلاحیت کھو چکے ہوں) کہ بش نے افغانستان پر حملے کے وقت کروسیڈ (یعنی صلیبی جنگ) کا لفظ استعمال کیا (اگرچہ منافقانہ سیاست کی وجہ سے اور مسلمانوں اور دنیا کو دھوکہ دینے کی غرض سے اسے مستقل دہرایا نہیں گیا)، عراق، لیبیا اور افغانستان کو فوجی قوت سے بہیمانہ کچل دیا جب کہ شام، پاکستان، یمن اور مالی پر حملے جاری ہیں۔ مغرب کے یہود ونصاریٰ نے یہ تہیہ کر رکھا ہے کہ کسی مسلمان ملک میں دین دار عناصر کو برسر اقتدار نہیں آنے دینا اور کسی کو شریعت نافذ نہیں کرنے دینی اور اگر کہیں دین دار عناصر پرامن سیاسی جدوجہد میں کامیاب بھی ہو جائیں (جیسے الجزائر، فلسطین اور مصر میں ہوا) تو انہیں حکومت نہیں کرنے دینی۔

اس کے علاوہ مغرب میں جعلی قرآن تیار کر کے پھیلایا جا رہا ہے۔ قرآن کو دہشت گردی کا ذمہ دار قرار دے کر اعلان کر کے سرعام جلایا جاتا ہے۔ پیغمبر اعظم وآخر (فداہ ابی وامی) کے کارٹون بنائے جاتے ہیں، مستشرقین کی علمی تحریک کے ذریعے احادیث رسول ﷺ کو ناقابل اعتماد ثابت کیا جاتا ہے، مسلمانوں کو دہشت گرد ثابت کرنے کے لیے اور مغرب میں اسلام کی اشاعت کو روکنے کے لیے ۹/۱۱ کا ڈرامہ رچایا جاتا ہے۔ مسلمان ملکوں میں بے دینی، بداخلاقی، بے راہ روی، فحاشی، عریانی اور زنا کو مروج کرنے کے لیے ابلاغی یلغار کی جاتی ہے اور مسلمان میڈیا اس غرض سے استعمال کیا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہود ونصاری اور مغربی فکر وتہذیب کے علم برداروں کا رویہ کل بھی اسلام اور مسلم

دشمنی کا تھا اور آج بھی اسلام اور مسلم دشمنی کا ہے۔لہٰذا ان کی اور ان کی فکر وتہذیب کی حمایت کوئی مسلمان بحالت ایمان اور بحالت ہوش وحواس تو نہیں کر سکتا البتہ وہ شخص کرسکتا ہے جو بے حس، بے عقل اور دینی حمیت سے عاری ہو۔

۳۔مغربی فکر وتہذیب:مسلمانوں کے زوال سے نکلنے میں سب سے بڑی رکاوٹ

مسلمانوں کے زوال کے اسباب کی دو قسمیں ہیں: ایک داخلی اور دوسرے خارجی۔ بلاشبہ داخلی اسباب اہم تر ہوتے ہیں لیکن خارجی اسباب کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔مسلمانوں کے زوال کے داخلی اسباب میں سے سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اپنے نظریۂ حیات (اسلام) سے ان کی وابستگی کمزور پڑ گئی جس کی وجہ سے ان میں وہ صلاحیتیں ناپید ہو گئیں جو آخرت میں متوقع کامیابی کے ساتھ دنیا میں ترقی اور کامرانی کے لیے ضروری ہیں۔مسلمان جب اس حالت ضعف میں تھے اور ان کے قصرِ عظمت کی دیواریں ہل رہی تھیں تو مغربی قوتوں کا خارجی عنصر حرکت میں آیا اور اس نے اپنی سازشوں سے (مثلاً ترکوں اور عربوں کو لڑا کر اور ترک خلافت کو جنگ عظیم میں اپنے مخالف گروپ میں دھکیل کر اور......) اس ہلتی دیوار کو دھکا دے کر گرا دیا اور گھر پر ناجائز غاصبانہ قبضہ کر لیا۔

اہل مغرب سفاک، خودغرض اور بے رحم ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت عیار اور ذہین بھی ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کی صدیوں سے جمع شدہ دولت کی لوٹ کھسوٹ اور انہیں کچلنے اور غلام بنانے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ انہوں نے برسوں امت مسلمہ کے غلبے کو برداشت کیا تھا اور اس کے اسباب پر غور کیا تھا لہٰذا اب انہوں نے مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے غلام رکھنے کی منصوبہ بندی کی اور مسلمانوں کو، خصوصاً ان کے حکمرانوں اور بالا دست طبقات کو، اپنی فکری اور ذہنی غلامی میں مبتلا رکھنے کا سوچا۔اس کے لیے انہوں نے مسلمانوں کے قائم کردہ اجتماعی زندگی کے سارے اداروں (معاشرت، معیشت، سیاست، تعلیم، قانون، عدلیہ......وغیرہ) کو تباہ و برباد کر دیا اور ان کی جگہ اپنی فکر وتہذیب کے مطابق نئے ادارے تعمیر کیے۔ اس کے لیے انہوں نے خصوصاً تعلیم وتربیت کے ادارے کو استعمال کیا (اس حوالے سے لارڈ میکالے کی ۱۸۳۲ء کی تعلیمی رپورٹ ایک کلاسیکل دستاویز ہے) کیونکہ ذہن سازی اور تعمیر شخصیت میں تعلیم ہی سب سے بنیادی کردار ادا کرتی ہے چنانچہ وہ مسلمانوں کو ذہنی غلام بنانے میں کامیاب ہو گئے اور چونکہ نام نہاد آزادی کے بعد بھی انہوں نے مسلمان ملکوں میں اقتدار انہی قوتوں کے سپرد کیا اور اس کے تسلسل کا انتظام کیا جو اس کی فکر وتہذیب سے مرعوب اور اس کے شائق تھے لہٰذا انہوں نے اس فکری

غلامی کو مسلمان نسلوں میں منتقل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ جس کا ایک مظہر آج یہ ہے کہ وہ شخص جس نے تیس کی دہائی میں اپنے دلائل سے مغربی فکر و تہذیب کے پرچخے اڑا دیئے (تنقیہات) اور اسلام پر اس کے اثرات کو ردّ کرتے ہوئے 'متکلم اسلام' کہلایا اور اس نے مغربی فکر و تہذیب کو اسلام کے مقابلے میں 'خالص جاہلیت' قرار دیا (پمفلٹ 'اسلام اور جاہلیت') آج اس کی اس قائم کردہ تحریک کا ایک رہنما ہم سے پوچھتا ہے کہ مغربی فکر و تہذیب کو غیر اسلامی قرار دے کر ردّ کرنے کے لیے تمہارے پاس دلیل کیا ہے؟

تو ہم عرض یہ کر رہے تھے کہ آج مسلمان جب زوال اور غلامی کے قعرِ ذلت سے نکلنا چاہتے ہیں اور اسلام کی عظمت گم گشتہ کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں تو اسلام کے حق میں جدوجہد کرنے والے عناصر کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ مغربی فکر و تہذیب اور اس کے علم بردار ممالک ہیں۔ انہوں نے اپنی فکر و تہذیب کی یونیورسلائیزشن اور گلوبلائزیشن کے لیے اور خصوصاً مسلمان معاشروں میں مغربی فکر و تہذیب کے اصول و اقدار کی ترویج کے لیے کروڑوں اربوں ڈالرز کا بجٹ مختص کر رکھا ہے۔ اس کے لیے وہ تعلیم، میڈیا، کلچر، ثقافت، ادب کے سارے پرامن ذرائع، اپنے گماشتہ مسلم حکمرانوں کے ذریعے استعمال کرتے ہیں اور اگر ان میں ناکام ہو جائیں تو ننگی جارحیت پر آتے ہیں اور نفاذ اسلام کے خواہش مندوں کا تورا بورا بنا دیتے ہیں (جاری ہے)۔

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنایئے۔

زرِاعانت سالانہ 400 روپے تاحیات 5000 روپے

نام... پتہ..
فون..

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ 136 نیلم بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور بھجوائیے

ٹرسٹ کو دیے جانے والے عطیات ٹیکس سے مستثنیٰ ھیں

منہج غلبۂ دین

محمد رشید☆

تنظیم اسلامی۔ فرد اور اجتماعیت کے درمیان توازن کا مسئلہ

اعتراض سے اعتراف تک کا سفر (آخری قسط)

سورۃ الانعام کی آیت ۸۵ میں اللہ تعالیٰ تمام جلیل القدر انبیاء کرام (حضرت ابراہیم، اسحاق، یعقوب، نوح، داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس علیہم السلام کے تذکرہ کے بعد اور حضرت اسماعیل، الیسع، یونس اور لوط علیہم السلام کے تذکرہ سے پہلے فرماتے ہیں کہ {كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ} یعنی سب کے سب انبیاء کرام صالح (اصلاح یافتہ) تھے۔ یہی اظہار سورۃ انبیاء میں بھی ہمیں ملتا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کا ذکر کرنے کے بعد پانچویں رکوع میں فرمایا جاتا ہے {وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ} اس کے بعد سورۃ انبیاء کے چھٹے رکوع میں مزید جلیل القدر انبیاء کرام کا تذکرہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں {اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ}۔ ''صالح اور مصلح'' کے علاوہ قرآن حکیم نے دیگر مقامات پر انبیاء کرام علیہم اسلام کو ''مسلم، مومن، عابد، متقی، منیب اور محسن'' بھی کہا ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی یہ وہ صفات ہیں جو قرآن اور دین کی تعلیمات کی جڑ، عطر، خلاصہ اور نچوڑ کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔

قرآن وسنت کا معروضی مطالعہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ شہادت علی الناس، اقامت دین، اسلام کے معاشی، سیاسی اور معاشرتی قوانین کا نفاذ کے ہر تصور اور ہر جدوجہد کو دین کے اسی عطر، اسی خلاصہ اور اسی نچوڑ کے ماتحت اور تابع رہ کر بروئے کار لانا ہوگا بصورت دیگر قرآن حکیم کی اس مرکزی ہدایت اور محوری تعلیم کی قیادت، کنٹرول اور حفاظت وسیادت قبول کیے بغیر دین اور اقامت دین کے نام پر کی جانے والی ہر کوشش کا نتیجہ سوائے فساد اور بگاڑ کے اور کچھ بھی نہیں نکلنا۔ قرآن حکیم کی درج ذیل

آیات اس اصول کا قطعی فیصلہ کردیتی ہیں:{يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ} (الاعراف:35)۔ اسی بات کو دوسرے مقام پر اس طرح بیان کیا گیا:{وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ} (الانعام:48)۔درج بالا دونوں قرآنی آیات ''اصلاح'' کو اللہ تعالیٰ کے تمام رسولوں کی تعلیمات کا مقصود اور جوہر قرار دے رہی ہیں۔دوسرے لفظوں

☆ abu_munzir1999@yahoo.com

میں قرآن حکیم تمام رسولوں کے لیے ''اصلاح'' کا لفظ استعمال کرتا ہے مگر ہمارے عباسی صاحب کا اصرار ہے کہ یہ لفظ صرف ایک نبی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

میرے محترم! قرآن حکیم تمام انبیاء کرام علیہم السلام کو انقلابی نہیں کہہ رہا بلکہ صالح (اصلاح یافتہ) کہہ رہا ہے اور تمام رسولوں کے فریضہ رسالت اور اصلاح کو لازم وملزوم قرار دے رہا ہے۔یہ محض لفظ ''انقلاب'' کے سحر کا نتیجہ ہے کہ غیر علمی دلائل اور دعووں کے ساتھ ''اصلاح'' کو کمتر اور خفیف ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔حیرت ہے کہ قرآن حکیم سے بافہم تعلق رکھنے والا کوئی ذہن یہ خلافِ قرآن دعویٰ کیسے کرسکتا ہے کہ یہ لفظ صرف ''ایک نبی کے لیے استعمال ہوا ہے''۔سورۂ اعراف کی آیت نمبر 142 بھی اس دعویٰ کی نفی کررہی ہے،جس میں ایک نہایت جلیل القدر رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے بھائی کو اپنا نائب (قائمقام) مقرر کرتے ہوئے ''اصلاح'' کے مہتمم بالشان فرض کی تلقین ان الفاظ میں کرتے ہیں:{وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ} ۔حضرت صالح علیہ السلام اپنی قوم کو تاکید فرماتے ہیں کہ{وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ} (سورۂ شعراء۔152)

قرآن حکیم انسانیت کو فکر اور عمل کی ہر خرابی سے نکال کر ''ایمان'' کے دامن امن میں لے آنا چاہتا ہے۔فکر وعمل کی ہر خرابی کے لیے قرآن حکیم نے لفظ ''ظلم اور فساد'' کا کثرت سے استعمال کیا ہے تو فکر وعمل کی ہر خوبی کے لیے قرآن حکیم نے کثرت سے ''ایمان اور عمل صالح'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔یہ دونوں الفاظ قرآن حکیم کی دعوت کا نچوڑ اور مغز اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے اپنی کثیر آیات میں دنیا وآخرت کی تمام کامیابیوں اور کامرانیوں کو ''ایمان اور عمل صالح'' سے مشروط کیا ہے۔اسی عمل صالح کو قرآن حکیم {الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ} (سورۂ کہف کی آیت 46 اور سورۂ مریم کی آیت 76 میں) کہا ہے یعنی ہمیشہ کی زندگی میں کام آنے والی چیز یہی عمل صالح ہے۔عمل صالح تمام

اعمال کو محیط ہے۔شریعت کے تمام احکام (Do's) کی پیروی کرنا اور تمام منہیات (Dont's) سے رک جانا ''عمل صالح'' ہے۔جس طرح مسجد کی تعبدی (مذہبی) زندگی میں شریعت کی اطاعت کرنا عمل صالح ہے بالکل اسی طرح معاشرت،معیشت،سیاست اور زندگی کے ہر ہر شعبہ میں اللہ کا مطیع بننا ''عمل صالح'' کے دائرہ میں آتا ہے۔اپنی استطاعت بھر حد تک اسی ''عمل صالح'' پر عمل پیرا ہونا اور نوع انسانی کو اس ''عمل صالح'' کی طرف بلانا ''اصلاح'' کہلاتا ہے۔گویا ''عمل صالح'' کو اپنے کردار میں جاری کرنا، دوسرے لوگوں کو اس کی طرف بلانا اور معاشرہ و ملک میں اس کو رائج و نافذ کرنے کی کوشش کرنا ''اصلاح'' کے زمرے میں آتا ہے۔''اصلاح'' میں اول و آخر اہمیت اپنے اعمال و کردار کو درست رکھنے کی ہوتی ہے۔جبکہ انقلاب'' میں توجہات کا مرکز ومحور دوسروں کا ظلم، دوسروں کا فساد اور دوسروں کی برائیاں ہوتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ''انقلاب'' کے تصور میں اول و آخر اہمیت دوسرے کے ظلم وفساد کو ختم کرنے کو حاصل ہوتی ہے۔''اصلاح'' کا تصور اپنے آپ کو اپنے رب کے حضور انتہائی حد تک جھکا دینے پر زور دیتا ہے جبکہ ''انقلاب'' کا تصور فریق ثانی (ظالم طبقہ/ نظام) کو تباہ و برباد کرنے پر زور دیتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ''اصلاح'' کے تصور اور اس فریضہ کی ادائیگی سے امن،سکون اور سلامتی کی فضا پیدا ہوتی ہے۔جبکہ ''انقلاب'' کے تصور ہی سے تباہی، فساد، خرابی اور خون خرابہ کے پیغامات نشر ہوتے ہیں۔سوال کیا جاسکتا ہے کیوں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ''اصلاح'' فساد کو ''صالح کردار'' کی طاقت سے ختم کرنے کا نام ہے، جبکہ ''انقلاب'' فساد اور بگاڑ کے طاقتور مراکز کو خون خرابہ کی زیادہ طاقت کے ذریعے تباہ و برباد اور ختم کرنے/ بدلنے کا نام ہے۔

''صالح'' اور ''اصلاح'' نہ صرف دنیا میں غیر معمولی عظمت و رفعت کا مقام ہے بلکہ آخرت کی غیر معمولی کامیابی اور بلند ترین مقام کے لیے بھی اس لفظ کا استعمال کیا گیا ہے۔اس کا اندازہ سورۂ نحل کی ان آیات سے لگایا جاسکتا ہے جن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ''امت'' کہا گیا اور نبی اکرم ﷺ کو ''ملت ابراہیمی'' کی پیروی کا حکم دیا گیا۔اسی مقام کے عین درمیان میں فرمایا گیا کہ {اِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِيْنَ} اس آیت میں حضرت ابراہیم علیہ اسلام کو آخرت میں ملنے والی عظیم ترین کامیابی کو ''مقام صالحین'' کا نام دیا گیا۔گویا ''اصلاح'' کے نتیجے میں انبیاء کرام کو دنیا میں حاصل ہونے والی بلند ترین کامیابی {كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ} اور آخرت کی بلند ترین کامیابی کا تذکرہ بھی ''مقام صالح'' کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے۔سورۂ شعراء میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا {وَ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ} ،حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا {وَ اَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ}

ان حوالہ جات سے واضح ہوتا ہے کہ ''صالح'' اور ''صالحیت'' قرآن حکیم کی نظر میں دین کا اتنا عظیم

الشان مقام ومقصود ہے کہ اسے نہایت جلیل القدر انبیاء کی دعاؤں کے طور پر پیش کیا جارہا ہے۔واضح رہے کہ دعا انسان کے نصب العین اور کامیابی کے اعلیٰ ترین درجات کے حصول کے عزم وارادے کا اپنے رب کے حضور ''روحانی اظہار'' کی ایک نہایت خوبصورت شکل کا نام ہے۔جبکہ انبیاء کرام علیہم السلام کی دعائیں صالح انسان کے اعلیٰ ترین عزائم و ارادوں اور دنیا وآخرت کی تمام کامیابیوں کو محیط ہوتی ہیں۔معترض موصوف کے اعتراض کہ یہ لفظ''اجتماعی اصلاح کے لیے استعمال ہی نہیں ہوا''(بالفاظ دیگر یہ لفظ''انفرادی نیکیوں کے لیے استعمال ہوا ہے'') کو اگر درست مان لیا جائے تو ان سے نہایت ادب سے عرض ہے کہ کیا یہ بات نہایت عجیب نہیں ہے کہ قرآن حکیم انفرادی اور چھوٹی چھوٹی نیکیوں کی نمائندگی کرنے والے الفاظ کو تو اتنے تکرار اور ایسے عظیم الشان انداز سے بیان کرتا ہے،لیکن موصوف کے مزعومہ اجتماعی فریضہ اور نصب العین کی نمائندگی کرنے والے بانجھ اور بے برکت لفظ''انقلاب'' کی تکرار تو بہت دور کی بات ہے،قرآن اسے (عربی کا لفظ ہونے کے باوجود) کسی ایک بھی نبی کی صفت یا ذمہ داری کے حوالے سے استعمال کرنا پسند نہیں کرتا۔

پھر جس مفہوم میں آپ غلبہ واقتدار اور''انقلاب'' کی جدوجہد کو دین کا مرکز ومحور بنا کر رکھ دیتے ہیں،قرآن کی نگاہ میں وہی غلبہ واقتدار (دنیا وآخرت دونوں جہانوں میں) صالح (اصلاح یافتہ) بندوں کا حق ہے۔سورۂ انبیاء میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:{وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ}۔اور سورۂ نور میں اس حقیقت کو ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے:{وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ}

سورۂ اعراف کی آیت170 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے{وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ط اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ}

اس آیت میں تمسک بالکتاب اور اقامۃ الصلوۃ (''کتاب'' کو مضبوطی سے تھامنا اور صلوۃ قائم کرنا) کو عنوان بنا کر دینی تقاضوں کو پورا کرنے والوں کو نمایاں اور امتیازی الفاظ میں ایسے''مصلح'' قرار دیا گیا ہے جن کا اجر اللہ تعالیٰ کبھی ضائع نہیں فرماتا۔اب بھلا بتایا جاسکتا ہے کہ''تمسک بالکتاب'' اور ''اقامۃ الصلوۃ'' کیا صرف ایک نبی (حضرت شعیب علیہ السلام) کی ذمہ داری تھی؟اور کیا یہ آیت قیامت تک کے آنے والے ان امتیازی صفات کے حامل تمام انسانوں کو مصلحین (اصلاح کرنے والے) کا خطاب نہیں دے رہی؟

حیرت اور افسوس ہے کہ قرآن حکیم سے تعلق رکھنے والا کوئی ذہن قرآن حکیم کی مغز کی تعلیم (اصلاح) کے بارے میں اس حد تک بھی شک وشبہ کا شکار ہوسکتا ہے جس کا اظہار محترم عباسی صاحب نے

اپنے مضمون میں کیا ہے۔ درج بالا تمام آیات کو جانتے بوجھتے نظرانداز کرتے ہوئے اگر کوئی صاحب علم یہ دعویٰ فرمائیں کہ (''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے یا کسی اور نبی کے لیے یہ لفظ استعمال ہی نہیں ہوا۔'') اور اس دعویٰ کو قرآن حکیم کی علمبردار جماعت اپنے جماعتی رسالے میں بڑی شان سے شائع کرے تو اس خلاف قرآن رویہ پر افسوس ہی کیا جاسکتا ہے۔

اس معترض ذہنیت کے ساتھ لفظ ''اصلاح'' پر اپنے اعتراضی نگارشات کو پیش کرنے کے بعد اگر کوئی صاحب یہ بیان جاری فرمائیں کہ'' اصلاح کے لفظ کو استعمال کرنے پر ہمیں نہ کوئی اعتراض ہے اور نہ ہی اس پر ہم کوئی شرم محسوس کرتے ہیں۔'' (ماہنامہ میثاق، جون 2014) تو کس کی جرات ہے کہ وہ اس پر ''اعتبار'' نہ کرے؟

اس تناظر میں محترم عباسی صاحب کے اُس بیان کی ''علمی اور اخلاقی'' پوزیشن کا تعین بھی بخوبی کیا جاسکتا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں کہ ''اب سوچا جاسکتا ہے کہ جب قرآن میں یہ لفظ صرف ایک نبی کے لیے استعمال ہوا ہے تو اس کے استعمال پر اصرار شدید اور ترک پر اعتراض زجر وتوبیخ کتنا مناسب ہے؟''۔ اوپر قرآن حکیم کی پیش کی گئی آیات سے اگر ہم یہ واضح کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ قرآن حکیم نے یہ لفظ (اصلاح) صرف ایک نبی کی بجائے تمام انبیاء ورسل علیہم السلام کے لیے استعمال کیا ہے تو کیا اب محترم عباسی صاحب ''اس کے استعمال پر اصرار شدید اور ترک پر اعتراض زجر وتوبیخ'' کرنے کی اجازت عنایت فرمانا پسند کریں گے؟

ان معروضات کے ساتھ اب ذرا محترم عباسی صاحب کے مزید دو واضح متضاد بیانات بھی سامنے رکھ لیے جائیں کہ:

ا۔ ''امت محمدی سے خطاب کے ضمن میں اس مصدر کے بہت سارے مشتقات ضرور استعمال ہوئے ہیں۔لیکن ان میں سے کسی جگہ بھی اجتماعی اصلاح، انقلاب یا اسلامی حکومت یا قانون کے قیام و نفاذ کے معنی میں استعمال نہیں ہوا'' اور

۲۔ ''اگر اصلاح کا لفظ استعمال کرنے والے انفرادی تربیت وتزکیہ کے ساتھ ساتھ نظام حکومت، کاروباری اداروں، معاشی سرگرمیوں، عائلی قوانین، فوجداری قوانین کی اصلاح بھی چاہتے ہیں تو ہمارے نزدیک لفظ اصلاح کا استعمال محمود ہے اور اسے ہی ہم انقلاب سے تعبیر کرتے ہیں'' (میثاق، جون 2014)

اول الذکر بیان میں یہ دعویٰ کیا جارہا ہے کہ قرآن حکیم میں امت محمدی سے خطاب کے ضمن میں اس مصدر کے بہت سارے مشتقات (یعنی اصلاح کے مفہوم کے حامل الفاظ(مثلاً صالح، مصلح

وغیرہ)ضرور استعمال ہوئے ہیں۔لیکن ان میں سے کسی جگہ بھی اجتماعی اصلاح، انقلاب یا اسلامی حکومت یا قانون کے قیام ونفاذ کے معنی میں یہ لفظ (اصلاح) استعمال نہیں ہوا۔اس کے بعد اگلے ہی سانس میں فرمایا جارہا ہے کہ(قرآن حکیم نے جن معنوں میں امت مسلمہ کے لیے لفظ''اصلاح'' کا استعمال ہی نہیں کیا)اگر ان معنوں میں لفظ اصلاح کا استعمال کیا جائے''تو ہمارے نزدیک لفظ اصلاح کا استعمال محمود ہے اور اسے ہی ہم انقلاب سے تعبیر کرتے ہیں''۔

فکر کی یہ وہ خرابی ہے جو اپنا ماتم آپ کررہی ہے۔موصوف کے اس مہمل اور لایعنی مفروضہ(کہ قرآن حکیم میں لفظ اصلاح کسی بھی جگہ پر اجتماعی اصلاح کے معنوں میں استعمال نہیں ہوا) کو چند منٹ کے لیے درست فرض بھی کرلیا جائے تو ہمیں سمجھ نہیں آتی کہ موصوف منطق کے کس اصول کے تحت یہ ثابت کرسکیں گے کہ قرآن حکیم کی فلاں آیت اجتماعی اصلاح، اسلامی حکومت یا قانون کے قیام ونفاذ اور نام نہاد انقلاب کے معانی میں استعمال ہوئی ہے؟ کیا ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب نہیں ہیں کہ''اصلاح'' کے لفظ میں''اجتماعی اصلاح'' کا مفہوم''انقلابی ذہن'' کو اس لیے نظر نہیں آرہا کیونکہ یہ لفظ فساد، تباہی، خون خرابہ اور بربادی سے انکار اور امن، سلامتی، سکون، آبادی اور ظاہری وباطنی خوشحالی کے مفہوم کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے، اور یہی چیز لفظ''انقلاب'' کی ضد ہے۔چنانچہ آج اکیسویں صدی کے ہمارے''اسلامی انقلابیوں'' کے لیے لفظ''اصلاح'' صرف اسی صورت قابل قبول اور محمود ہے جب یہ انقلاب کا ''چھوٹا'' بن کر رہنا قبول کرے۔

موصوف کی یہ منطق ان کی''معقولیت'' پر بھی سوالیہ نشان ڈال دیتی ہے کہ لفظ''اصلاح'' کو قرآن حکیم نے جس مفہوم میں بیان ہی نہیں فرمایا اگر ان معنوں(مفہوم) میں لفظ اصلاح کا استعمال کیا جائے تو موصوف کے نزدیک''لفظ اصلاح کا استعمال محمود ہے'' اور اسے ہی وہ''انقلاب سے تعبیر کرتے ہیں''۔

لفظ''انقلاب'' کے معاملہ میں فکر کی یہ وہ کوتاہی ہے جو اپنا منہ آپ چڑا رہی ہے۔یہ اس حقیقت کا غیر ارادی اظہار ہے کہ منحوس اور بے برکت لفظ''انقلاب'' اور قرآن کا آپس میں کوئی مثبت تعلق نہیں ہے۔یعنی آپ کو لفظ اصلاح کا قرآنی مفہوم اور قرآنی استعمال اس لیے کمتر محسوس ہوتا ہے کہ قرآن نے اس لفظ کو''انقلاب'' کا طفیلی بنا کر پیش نہیں کیا، چنانچہ قرآن کے برخلاف آپ کو اس لفظ کا وہی استعمال پسند ہے جو اسے''انقلاب'' کا طفیلی اور حاشیہ بردار بنا کر پیش کرے۔رہا اسلامی حکومت یا قانون کے قیام ونفاذ کا معاملہ اگر تو موصوف اسے امت مسلمہ کی ذمہ داری سمجھتے ہیں اور مسلمانوں کی اجتماعیت کے لیے دین کا قیام ونفاذ فرض سمجھتے ہیں تو پھر وہ تسلی جمع خاطر رکھیں، اس صورت میں یہ ذمہ داری لفظ ''اصلاح'' کا بھی ایک اہم جزو اور حصہ ہے۔تاہم اس کی ادائیگی میں دین نے ایک ترتیب، توازن اور تناسب رکھا ہے، اصلاح کا لفظ اس ترتیب اور توازن کو برقرار رکھنے پر زور دیتا ہے جبکہ تجربہ گواہ ہے

کہ''انقلاب'' کا لفظ اس ترتیب، تناسب اور توازن کو بگاڑنے میں جنون کی حد تک مبتلا ہے۔اسی کا اظہار تنظیم اسلامی کے تاسیسی عہد میں ان الفاظ میں کیا گیا:

''دین کی تائید ونصرت اور شہادت واقامت یقیناً فرائض دینی میں سے ہیں لیکن ان کے لیے کوئی ایسی اجتماعی جدوجہد ہرگز جائز نہیں جو افراد کو ان کے اصل نصب العین سے غافل کر کے انہیں محض ایک دنیوی انقلاب کے کارکن بنا کے رکھ دے''۔(از تعارف تنظیم اسلامی)

راقم نے اپنے زیر بحث مضمون میں اپنی گفتگو کا اختتام اپنے اس دکھ پر کیا تھا:

''لیکن افسوس صد افسوس! ان نہایت واضح اور صاف وشفاف اساسات سے تمسک کرنے اور انہی بنیادوں پر جماعت کی اجتماعی تنظیم کرنے کی بجائے رفتہ رفتہ اس سے نظریں چرالی گئیں اور''انقلاب اور طریق کار'' کی لاطائل اور نہ ختم ہونے والی نظری بحثوں میں اپنے اوقات اور صلاحیتوں کو برباد کرنا شروع کر دیا گیا۔اور جب مخلص رفقاء اور ساتھیوں نے قرآن حکیم اور تنظیم اسلامی ہی کی اساسات اور بنیادوں کی روشنی میں احیائے اسلام کی شرط لازم یعنی ایمان کی آبیاری، تزکیہ اخلاق اور تعمیر سیرت وکردار کے فریضہ سے غفلت برتنے کی طرف متوجہ کیا تو اپنے ہی اساسی وتشخیصی بیانات کو مسخ کرنے اور منطق کی خراد سے ان پر رندہ چلانے سے بھی گریز نہ کیا گیا، فهل من مدكر؟

''سب سے بڑا المیہ اور سب سے بڑا بحران یہ ہے کہ تنظیم اسلامی جماعت اسلامی کی انتخابی سیاست میں شمولیت کے بے شمار حقیقی وفرضی نقصانات گنوانے کے باوجود خود تزکیہ قلوب، تعمیر سیرت، اصلاح فرد ومعاشرہ اور دعوت الی اللہ کے معاملہ میں کوئی متاثر کن پیش رفت نہ کر سکی۔ بلکہ اس کے برعکس جماعت اسلامی اگر انتخابی سیاست کی عملی دلدل میں صلاحیتوں اور اوقات کو ضائع کرتی نظر آتی ہے تو تنظیم اسلامی بجائے اصلاح فرد ومعاشرہ پر اپنی صلاحیتوں کو مرکوز کرنے کے غلبہ دین کے آخری مرحلہ میں اجتہاد کے ذریعے اپنے دریافت کردہ''غیر مسلح تصادم'' نامی فلسفہ یعنی''احتجاجی سیاست'' کو انقلابی طریق کار کا عنوان دے کر صبح وشام اس کی خوبیاں گنوانے اور اسے اپنا ایک بہت بڑا کارنامہ اور دریافت قرار دینے میں اوقات اور صلاحیتوں کو ضائع کرتی نظر آتی ہے۔اور اس سے بھی بڑا المیہ یہ ہے کہ ابھی تو''احتجاجی سیاست'' کے حتمی مرحلے کا آغاز ہی نہیں ہوا تھا کہ تنظیم اسلامی کے ذمہ داران وکارکنان میں اخلاقی تنزل، سیرت وکردار کے بگاڑ، ضعف ایمان اور ضیاع وسہو عبادات میں بگٹٹ اضافہ ہوتا چلا گیا۔اور جس رفیق نے بھی اس بگاڑ کی طرف سنجیدگی سے توجہ دلائی اور اس کی اصلاح پر صلاحیتوں کو مرکوز کرنے پر اصرار کیا، اسے بالآخر تنظیم بدری کے انجام سے دوچار ہونا پڑا۔''

راقم کے زیر بحث مضمون کا یہ وہ فیصلہ کن (Conclusive) تجزیہ تھا، تنظیم اسلامی کے ذمہ داران کے پاس جس کا کوئی معقول جواب نہیں ہے۔

اس طویل سمع خراشی کے بعد ان سطور کا حقیر راقم عرض کرتا ہے کہ محترم عباسی صاحب کی طرف سے راقم کی تردید میں پیش فرمائے گئے سید مودودی کی تحریروں کے کم و بیش تمام اقتباسات ''سیرت وکردار، اخلاق، اخلاقی سپرٹ، تزکیہ، فرد اور معاشرہ کی اصلاح'' کو اسلامی نظام کے قیام کا ناگزیر اور ناقابل مفر تقاضا قرار دیتے ہیں۔ ہمارا دکھ بھی یہی تو ہے کہ امت کی نشاۃ ثانیہ اور ملت کے استحکام و غلبہ کے لیے جس ناگزیر، ناقابل مفر اور نہایت کٹھن تقاضہ اور فریضہ کا اظہار سید مودودی مرحوم کے افکار و تحریروں میں ملتا ہے، جماعتی سطح پر اس ناگزیر فریضہ سے اغماض برتنے کی پاداش میں ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم نے جماعت کو مسترد کر دیا اور تنظیم اسلامی کی بنا اس عہد اور پختہ عزم پر ڈالی کہ ''سیرت وکردار، اخلاق، اخلاقی سپرٹ، تزکیہ، فرد اور معاشرہ کی اصلاح'' کے معاملہ میں جس کوتاہی اور غفلت کا مظاہرہ جماعت اسلامی نے کیا، تنظیم اسلامی اس معاملہ میں ہر دم اور ہر آن چوکنا رہے گی۔ لیکن عملاً تنظیم اسلامی کے ذمہ داروں نے کیا کیا؟

انذار، تذکیر، تزکیہ اور قلوب و کردار کی اصلاح پر اپنی صلاحیتوں اور توجہات کو مرکوز کرنے کی بجائے لفظ ''انقلاب'' کو اوڑھنا بچھونا بنالیا گیا۔ چنانچہ جماعت اسلامی چھوڑنے کے بعد ربع صدی تک کہا جاتا رہا کہ دنیا کا کوئی انقلاب ''مسلح تصادم'' کے بغیر نہیں آیا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں اسلامی انقلاب کے مسلح تصادم کا مرحلہ ''غزوۂ بدر'' ہے۔ اور نتیجہ یہ نکالا گیا کہ اسلامی انقلاب کا مسلح تصادم ''قتال فی سبیل اللہ'' ہے۔ لہٰذا قرآن حکیم کی قتال ہی کی آیات سے اقامت دین کا فریضہ مبرہن کیا جاتا رہا۔ لیکن 1980 کے بعد اچانک یاد آیا یا کسی نے یاد دلایا کہ (1) ہم جس معاشرے میں ''اسلامی انقلاب'' برپا کرنا چاہتے ہیں وہ تو مسلمانوں کا معاشرہ ہے جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلم معاشرے میں ''اسلامی انقلاب'' برپا کیا تھا۔ (2) دوسری بات یہ یاد آئی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قتال تو چودہ سو سال پرانے غیر متمدن اور قبائلی معاشرے میں تھا، اس معاشرے میں مسلمانوں اور کافروں کی جنگی طاقت میں بڑا معمولی فرق تھا جبکہ آج کی دنیا تو متمدن، سائنسی اور ترقی یافتہ ہو چکی ہے، مسلم انقلابی جماعتوں اور ملکی افواج میں جنگی طاقت کا فرق غیر معمولی ہو چکا ہے۔ (3) جبکہ متمدن دنیا نے ''احتجاجی تحریک'' کے ذریعے عوامی مطالبات منوانے کے حق بھی تسلیم کر لیا ہے۔ ان تین دلائل کی بنیاد پر ''اسلامی انقلاب'' کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جدوجہد کے آخری مرحلہ (قتال فی سبیل اللہ) میں اجتہاد کا اعلان کیا گیا۔ دلیل دی گئی کہ عصر حاضر میں ''اسلامی انقلاب'' کے لیے مسلح تصادم (قتال فی سبیل اللہ) محال، ناممکن اور خارج از بحث ہو گیا ہے۔ (جبکہ اس سے پہلے ''اسلامی انقلاب'' کے لیے یہ فرض عین تھا)۔ چنانچہ ''اسلامی انقلاب'' کے آخری مرحلہ (مسلح تصادم/قتال فی سبیل اللہ) کو ہٹا کر اس کی جگہ پر ''غیر مسلح تصادم'' (پُرامن احتجاجی تحریک) کو بٹھا دیا گیا۔ اسی فکری پسپائی کے نتیجے میں تنظیم اسلامی کے مونوگرام

سے تلواروں کو بھی ختم کر دیا گیا۔اس کے بعد اصل کام (تزکیہ واصلاح قلوب و کردار) کی قیمت پر اس ''عظیم طریق کار'' کی دعوت،تکرار،اصراراور رٹ پر صلاحیتوں اور اوقات کو برباد کیا جاتا رہا۔

ایک غلط تعبیر نے غلط اجتہاد کو جنم دیا۔دین اور سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ''انقلاب'' کے مغربی تصورات میں مقید کر کے مطالعہ کرنے کی کوشش اس ساری خرابی کی جڑ ہے۔یہ درحقیقت اس سادہ اور متفق علیہ حقیقت سے فرار کا خمیازہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک قبیلہ اور فرقہ کے سردار کی حیثیت سے نہیں بلکہ مدینہ کی نوزائندہ اسلامی ریاست کے سربراہ اور امام کی حیثیت سے نئی تشکیل پانے والی ''امت'' اور اس کے دین وایمان کے تحفظ کے لیے غزوۂ بدر کی جنگ لڑی۔''غزوۂ بدر'' جو کہ قیامت تک کے انسانوں کے لیے''جہاد وقتال'' کا اعلیٰ ترین نمونہ (Perfect Model) ہے،یہ(معاذ اللہ)اس لیے روبہ عمل نہیں آیا کہ خونریزی کی خون آشام تلوار سے لوگوں کو ڈرا کر زبردستی ان پر دین کا ''غلبہ واقتدار'' جاری ونافذ کیا جائے۔بلکہ کائنات کا یہ اعلیٰ ترین ''جہاد وقتال'' امن،ایمان،اسلام اور انسانیت کی محافظ امت کے دفاع اور تحفظ کے لیے روبہ عمل آیا۔''غزوۂ بدر'' (معاذ اللہ) کسی نام نہاد انقلابی گروہ کا اپنے انقلاب کو خون خرابہ اور مسلح کارروائی کے ذریعے لوگوں کی گردنوں پر زبردستی مسلط کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ یہ امن اور ایمان کی نمائندہ طاقت پر امن اور ایمان کے دشمنوں کے مسلح حملہ اور جنگ کا ایمانی جواب ہے۔منہج نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تعبیر''انقلاب'' کے نام نہاد اور فساد انگیز تصور کی روشنی میں کرنا فساد کی وہ جڑ ہے جو قتال فی سبیل اللہ کے اعلیٰ ترین نمونہ ''غزوۂ بدر'' پر اجتہاد کا تیشہ چلاتے ہوئے''احتجاجی سیاست'' (غیر مسلح تصادم) کو اس کے مقام پر لابٹھاتی ہے۔یہ سوچ غیر شعوری طور پر اپنے منطقی نتیجہ کے اعتبار سے درحقیقت جہاد کے اعلیٰ ترین نمونہ کی جڑوں پر تیشہ چلا دیتی ہے اور اس طرح قرآن حکیم کی جہاد وقتال کی آیات کی منسوخی کو فکری جواز عطا کرتے ہوئے فساد کا چوپٹ دروازہ کھول دیتی ہے۔تعبیر کی یہ کوتاہی اور فساد اس ناقابل مفر حقیقت سے فرار کا نتیجہ ہے جس کا اظہار سید مودودی مرحوم ومغفور نے ان معرکتہ الآرا الفاظ میں کیا:''دوسرا طریقہ یہ ہے کہ معاشرے کو جڑ سے ٹھیک کرنے کی کوشش کی جائے اور ایک عمومی تحریک اصلاح کے ذریعے سے اس میں خالص اسلامی شعور وارادہ کو بتدریج اس حد تک نشوونما دیا جائے کہ جب وہ اپنی پختگی کو پہنچے تو خود بخود اس سے ایک مکمل اسلامی نظام وجود میں آجائے۔'' ان الفاظ میں''انذار،تذکیر،تزکیہ اور اصلاح فرد ومعاشرہ'' کی اس نبوی جدوجہد کے عطر کو سمو دیا گیا ہے جس کے نتیجے میں''مدینہ کی پہلی اسلامی ریاست کسی بھی قسم کی''جنگ اور خون خرابہ'' کے بغیر وجود میں آئی تھی۔غزوۂ بدر اصلاً اس ''امن کی ریاست'' کے تحفظ اور دفاع کے لیے اور کفر کے مسلح حملہ کے جواب میں وقوع پذیر ہوا تھا۔لیکن افسوس وہ سوچ جو دین،قرآن اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو''انقلاب'' کے خونی فلسفہ میں محصور کر کے رکھ دیتی ہے،اس کے سامنے اگر اتفاقاً بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرت کو''اصلاح'' کے

سادہ، سچے اور قرآنی الفاظ میں بیان کیا جائے تو وہ فوراً ''اصلاح'' کے قرآنی لفظ کو'انقلاب'' کے غیر قرآنی اور خونی لفظ سے بدل دیتی ہے۔

انقلاب کا'' اژدھا'' جماعت اسلامی کے اعلیٰ ترین دماغوں، خوبصورت ترین قرآنی افکاراور مضبوط ترین کرداروں کو نگل گیا۔ اور بیسویں صدی کی طاقتور ترین خالص اسلامی جماعت کی توجہات کو ''انذار، تذکیر، تزکیہ اور اصلاح'' کے محوری (Pivotal) فریضہ سے ہٹا کر انقلاب کے نعروں، انتخاب کے تھکا دینے والے جھنجٹ اور مستقبل کے خیالی نقشوں اور منصوبوں کی دلدل میں پھنسا کر رکھ دیا۔ اس بحران اور زوال سے نکلنے کی زوردار آواز، آرزو اور عزم کا اظہار تنظیم اسلامی کے تاسیسی عہد اور ''اسلام کی نشاۃ ثانیہ......کرنے کا اصل کام'' میں نظر آتا ہے۔ لیکن افسوس ''انقلاب'' کا جو اژدھا جماعت اسلامی کے صالح ترین افکار اور کردار کو کھا گیا اور جماعت کو انتخابی سیاست کی دلدل میں پھنسا کر''اخلاق وکردار کے بحران نامی صحرا'' میں پھنسا کر منزل کو دور بہت دور کر گیا، یہی خونخوار''اژدھا'' تنظیم اسلامی کی قیادت کو''غیر مسلح تصادم'' کے عنوان سے ''احتجاجی سیاست'' کی فکری دلدل میں پھنسا کر''اخلاق وکردار'' کی اصلاح کی کوششوں کو اسی طرح کھا گیا، جس طرح جماعت اسلامی کی''اصلاح کی جدوجہد'' ہڑپ کر گیا تھا۔

جماعت اسلامی''انقلاب'' کے اس خونخوار اژدھا کے زہر کا نسبتاً کم شکار ہوئی کیونکہ ہمارے ناقص مطالعہ کے مطابق جماعت اسلامی نے کبھی بھی ''انتخابی سیاست'' کو قتال فی سبیل اللہ کا متبادل نہیں کہا، نہ جماعت نے''انتخابی سیاست'' کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مقدس جدوجہد (Perfect Model) کے کسی مرحلہ جتنا تقدس دینے کی کوشش کی۔ لیکن تنظیم اسلامی نے''احتجاجی سیاست'' (غیر مسلح تصادم) کو قتال فی سبیل اللہ کے متبادل کا نام دے کر اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور کے قتال فی سبیل اللہ کے Perfect Model میں اجتہاد کا نعرہ بلند کر کے درحقیقت قرآن حکیم کی درجنوں آیات اور نصوص میں اجتہاد کا اور قتال فی سبیل اللہ کی منسوخی کا چوپٹ دروازہ کھول دیا ہے۔ اس سوچ اور رویہ کے ساتھ اگر یہ ذہن''قتال فی سبیل اللہ'' سے بھی اپنے لگاؤ کا اظہار کرتا ہے تو یہ کسی''صحتمندانہ ذہن'' کی غمازی نہیں ہے۔

جو ذہن اس فکری سانچے کے ساتھ ایک طرف''جہاد وقتال'' کے قرآنی ونبوی حکم میں اجتہاد کر کے اس کا متبادل بھی دریافت کرنے کا دعویٰ کرتا ہو (جس کے نتیجے میں جہاد وقتال فی سبیل اللہ کا مقام اور شکل ہر دو مسخ ہو جاتے ہوں) اور دوسری طرف''جہاد وقتال'' سے اپنے مضبوط فکری لگاؤ کا بھی اظہار کرتا ہو، ایسا ذہن کسی بھی صورت ایک''متوازن ذہن'' کہلانے کا مستحق نہیں۔ یہ ایک قسم کا''فکری تضاد'' اور ذہنی الجھاؤ ہے۔ مذہب کے عنوان سے دنیا کی تمام خرابیاں اور گمراہیاں اسی فکری تضاد اور الجھاؤ سے جنم لیتی رہی ہیں۔ جس سے چھٹکارا پائے بغیر صراط مستقیم کا سفر جاری رکھنا ناممکن ہے۔

تنظیم اسلامی کی رفاقت کے عرصہ ((1992-2002 کے آخری چھ سالوں میں ہم نے دل و

جان سے کوشش کی کہ اس عدم توازن کو توازن میں بدل دیا جائے اور تنظیم اسلامی کے ذمہ داران فکر اور قول وعمل کے تضادات سے نکل آئیں۔محض باتوں،تقریروں اور لفظوں سے دنیا فتح کرنے کی بجائے حسن کردار اور اعلیٰ اخلاقی رویوں سے قلوب کو فتح کریں لیکن ہمیں اعتراف ہے کہ ہماری ناقص صلاحیتوں کی بنا پر ہماری ہر کوشش ہمارا منہ چڑاتی رہی اور زوالِ کردار کا سفر جاری رہا تاہم ؎

دل ناامید نہیں ناکام ہی تو ہے لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

تعلیم وتربیت ڈاکٹر محمد امین

موجودہ مغرب زدہ ماحول میں اسلامی سکولوں کے لیے مجوزہ
لائحہ عمل جسے اپنا کر وہ اپنے کردار کو کسی حد تک قابل قبول بنا سکتے ہیں

'اسلامی سکول' کچھ تو کریں ☆

مئی ۲۰۱۴ء سے شروع ہونے والی بحث 'اسلامی سکول کیوں ناکام ہیں؟' کے سلسلے کی آخری تحریر

ہم نے اپنی گزشتہ تحریروں میں یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ ہمارا موجودہ تعلیمی نظام اپنی شکل اور سپرٹ میں انگریزی استعمار کے قائم کردہ نظام تعلیم کا تسلسل ہے اور اسلامی تناظر میں اس کی تشکیل نو (Reconstruction) اور اسے مغربیت کے شکنجے سے نکالنے (Dewesternization) کی اشد ضرورت ہے۔مِن جملہ بہت سے کاموں کے جو چند اہم کام کیے جانے ضروری ہیں وہ یہ ہیں:

سلبی اقدامات

وہ امور جو مغربی فکر وتہذیب کی پیروی کا ذہن بناتے ہیں ترک کر دیئے جائیں جیسے: انگریزی ذریعہ تعلیم اور لازمی انگریزی، ۲۔مخلوط تعلیم ۳۔مغربی مصنفین (یا کالے انگریزوں) کی تیار کردہ نصابی کتب جیسے آکسفورڈ کی ۴۔مغربی تعلیمی اداروں کے امتحانات (مثلاً او،اے لیول) ۵۔انگریزی طرز کی یونیفارم ۶۔مغربیت پھیلانے والی ہم نصابی سرگرمیاں جیسے مخلوط پکنک،کنسرٹ، ڈرامے، فیشن شوز، سوئمنگ پول، میوزک کلاسیں، کھلے عام لڑکیوں کی کھیلیں، ۷۔موجودہ طرز کے پری سکول جن میں دوتین سال تک بچے کو اچھے خاصے بستے کے ساتھ باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے......وغیرہ وغیرہ۔

مثبت اقدامات

تعلیم کو اسلامی بنانے اور اسلامی ذہنیت پیدا کرنے والے اقدامات مثلاً:

نصاب: عمرانی علوم کی اسلامی تناظر میں تدوین نو، روٹین کی اسلامیات کے علاوہ قرآن وسنت کی نصوص اور تعلیمات کو شامل نصاب کرنا، سادہ اور دلچسپ انداز میں قرآنی عربی، سوانح اور اسلامی تاریخ، مختصر پری سکول......وغیرہ

☆ چونکہ بات سکول کے حوالے سے ہو رہی ہے اس لیے ہم نے یہ عنوان اختیار کیا ہے ورنہ ان باتوں کا اطلاق ان کالجوں اور یونیورسٹیوں پر بھی ہوتا ہے جن کے مالکان تعلیمی کام اسلامی تناظر میں کرنا چاہتے ہیں۔

تربیت انتظامیہ: انتظامی تربیت کے علاوہ اس امر کی تذکیر کہ ان کا کام محض پیسے کمانا اور کامیاب ادارے چلانا نہیں بلکہ ایسے اقدامات کرنا اور ایسا ماحول پیدا کرنا ہے جس کے نتیجے میں یکسو اور عملی مسلمان پیدا ہوں۔

تربیت اساتذہ: طرق تدریس اور پیشہ ورانہ تربیت کے علاوہ اساتذہ کی ایسی تربیت کہ وہ خود یکسو اور باعمل مسلمان بنیں اور اپنے طلبہ کو بھی ایسا ہی بنائیں۔ طلبہ کی تعمیر سیرت اور تشکیل کردار ان کا بنیادی کام ہو۔

تربیت طلبہ: طلبہ کو صرف نوشت وخواند اور کوئی ہنر سکھانا ہی تعلیمی ادارے کی ذمہ داری نہ ہو بلکہ ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا، ان کے اخلاق سنوارنا اور انہیں یکسو اور عملی مسلمان اور اچھا انسان بنانا بھی سکول کے بنیادی فرائض میں شامل ہو۔

ہم نصابی سرگرمیاں: ساری ہم نصابی وغیر نصابی سرگرمیاں اس انداز میں تشکیل دی جائیں جو طلبہ کے اندر اسلامی فکر وعمل کو پروان چڑھائیں، اسلامی اصول واقدار کو مرغوب بنائیں اور انہیں یکسو اور عملی مسلمان اور ایک اچھا انسان اور شہری بنائیں۔

یہ کام اتنے اہم ہیں کہ امت مسلمہ اور ساری مسلم حکومتوں کو مل کر کرنے چاہئیں اور اگر وہ نہ کریں تو امت کی سطح پر کام کرنے والی اسلامی تنظیموں اور مخیر حضرات کو کرنے چاہئیں۔ پاکستانی حوالے سے بات کرتے ہوئے یہ کام حکومت پاکستان کو کرنے چاہئیں اور اگر حکومت نہیں کرتی تو اسلامی جماعتوں اور اساتذہ وطلبہ کی تنظیموں کو مل کر کرنے چاہئیں اور چونکہ اسلام میں ہر شخص مکلف ہے اور اپنی ذاتی حیثیت میں اللہ کے حضور جوابدہ ہے لہٰذا ہر سکول کے مالک اور منتظم کی یہ ذاتی ذمہ داری ہے کہ جہاں تک ہو سکے

وہ ان اصولوں پر عمل کرے اور اگر اسے آخرت عزیز ہے تو اس میں کسی قربانی سے دریغ نہ کرے۔ہم نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ ہمارے 'اسلامی سکول' بالعموم اس ذمہ داری کو پورا کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

موجودہ مضمون میں ہم یہ عرض کرنے کی کوشش کریں گے کہ وہ 'اسلامی سکول' جو مذکورہ بالا خطوط پر کماحقہ کام کرنے کی جرأت و ہمت نہیں رکھتے لیکن اصلاح کی خواہش ضرور رکھتے ہیں اور اسی طرح وہ لوگ جو نیا 'اسلامی سکول' قائم کرنے کے خواہش مند ہیں لیکن انہی مروجہ حدود (اور comprises) کے اندر رہتے ہوئے، ہم انہیں کچھ مشورے دیں کہ اگر وہ پورا کام کماحقہ نہیں کر سکتے تو کچھ نہ کچھ تو کریں کہ کچھ نہ کرنے سے بہرحال کچھ نہ کچھ کرنا ہی بہتر ہے...... لیکن اس ضمن میں عملی تجاویز دینے سے پہلے ہم چند ضروری باتیں تمہیداً عرض کرنا چاہتے ہیں:

۱۔ صحیح نیت و اخلاص

یہ نیت کرنا کہ آپ اس لیے اسلامی سکول کھولنا چاہتے ہیں تا کہ آپ اس سے پیسے کمائیں اور آپ اس لیے سرمایہ کاری کر رہے ہیں کہ اس سے بہت سا نفع کمائیں...... یہ غلط نیت ہے اور بہت سی خرابیوں کی جڑ یہ غلط نیت ہی ہے کیونکہ تعلیم اسلام میں 'مال تجارت' نہیں ذریعۂ تعمیر و اصلاح فرد ہے لہٰذا صحیح نیت یہ ہے کہ آپ اس لیے سکول کھولنا چاہتے ہیں کہ آپ مسلمان بچوں کو 'قرآن و حکمت کی تعلیم دیں اور ان کے نفوس کا تزکیہ کریں' یہ نیت اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھائی (۱) تھی اور سابقہ انبیاء کو بھی (۲) اور قرآن اس پر شاہد ہے اور قرآن سے بڑھ کر بڑی اور مصدقہ شہادت کس کی ہو سکتی ہے؟

آپ کہیں گے کہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کام تو وہی ہے۔نہیں جناب! فرق پڑتا ہے اور بہت پڑتا ہے۔ایک صحابی کا مکان بن رہا تھا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم پاس سے گزرے تو پوچھا 'یہ روشن دان کیوں رکھا ہے؟' انہوں نے جواب دیا 'ہوا کے لیے' آپؐ نے فرمایا کہ اگر تم یہ جواب دیتے کہ اذان کی آواز سننے کے لیے تو جب تک یہ مکان اور روشن دان رہتا تمہیں ثواب ملتا رہتا...... اور ہوا تو ملتی ہی رہتی۔ اسی لیے آپؐ نے فرمایا کہ 'انما الاعمال بالنیات' یعنی اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔ امام بخاری اس حدیث کو اپنی صحیح کے شروع میں پہلی حدیث کے طور پر لائے ہیں اور بعض محدثین نے کہا ہے کہ یہ حدیث نصف دین کو کفایت کرتی ہے...... ہم کہتے ہیں کہ یہ حدیث اتنی اہم ہے کہ پورے دین کو کفایت کرتی ہے کیونکہ سوئے نیت کے ساتھ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، نکاح، طلاق، تجارت، جہاد...... غرض کچھ بھی فائدہ مند نہیں۔

اور لوگ نیت صحیح رکھنے والی اس حدیث کے مفہوم پر بھی غور نہیں کرتے۔ اس حدیث کو اس کے صحیح تناظر میں ہم صرف اس وقت سمجھ سکتے ہیں جب ہم اخلاص کے مفہوم کو سامنے رکھیں۔ اخلاص کا مطلب یہ ہے کہ ہر کام صرف اللہ کے لیے اور اس کی رضا کے لیے کیا جائے (وَمَآ اُمِرُوۡٓا اِلَّا لِیَعۡبُدُوا اللّٰہَ مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ...... البینۃ ۹۸ : ۵) اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم شرک (اصغر یعنی ریاء) سے کوئی کام کرتے ہو تو اللہ اسے ہرگز قبول نہیں فرماتا۔لہٰذا حدیث کا

---

۱) البقرہ ۱۲۹:۲

۲) الاعلیٰ ۱۷:۸۷

مطلب یہ ہے کہ اعمال کی جزا اللہ تعالیٰ صرف اس وقت دیں گے جب نیت صحیح ہوگی۔ اگر نیت صحیح نہ ہوگی تو جزا نہیں ملے گی۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ سلم نے دوسری جگہ فرمایا کہ اگر کوئی جہاد کرتا ہے لیکن اس کی نیت اعلاء کلمۃ اللہ کی نہیں تو اسے جہاد کا ثواب نہیں ملے گا[۱] اور اگر ایک مخیر آدمی اللہ کی راہ میں بظاہر انفاق کرتا ہے لیکن اس کی نیت نام ونمو اور سخی کہلانے کی ہے تو اسے انفاق کا ثواب نہیں ملے گا بلکہ ایسا شخص غلط نیت، ریا، عدم اخلاص اور شرک کی وجہ سے مستحق عذاب ہوگا[۲]......اور یہی معاملہ سارے اعمال میں ہوگا۔

ہمارے ایک دوست حکیم صاحب ہیں انہوں نے حرم کعبہ میں دعا کی کہ اے اللہ! میں نیت کرتا ہوں کہ تیری مخلوق کی خدمت کروں گا اور انہیں دکھوں سے بچاؤں گا اور آج کے بعد کسی مریض کو طبی مشورہ دینے کی فیس (Consultation) بھی نہیں لوں گا چنانچہ اس کے بعد انہوں نے کبھی کسی مریض سے فیس مشورہ نہیں لی۔ اگر کوئی دوا لے تو اس میں نفع کا کچھ مارجن ہوتا ہے کہ جڑی بوٹیوں کی خرید، دوا بنانے والے کی تنخواہ، دکان کا کرایہ وغیرہ اس کا حصہ ہوتا ہے......اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی شہرت اور نیک نامی میں اضافہ ہوگیا، مریض ان کے پاس کثرت سے آنے لگے اور وہ بہت خوش حال ہیں۔

لہٰذا اگر آپ نیت کرلیں کہ آپ نے سکول تجارت اور کاروبار کے لیے نہیں کھولنا بلکہ مسلمان بچوں کی اسلامی تعلیم وتربیت کے لیے کھولنا ہے اور اس سے آپ کے پیش نظر صرف اللہ کی خوشنودی ہے تو فیس تو آپ کو پھر بھی ملے گی ہی کہ یہ (اگرچہ غلط ہے لیکن) آج کل معاشرے کا دستور اور رواج ہے۔

یقین رکھیں کہ اس نیت کی برکت سے آپ کا سکول زیادہ کامیاب ہوگا اور حوصلہ رکھیں کہ آپ کا سکول ناکام نہیں ہوگا۔

۲۔کاروباری دیانت کا تقاضا

ہم نے کہا کہ اسلام میں تعلیم مال تجارت نہیں دعوت و اصلاح کے لیے اسوۂ پیغمبری ہے لیکن مغرب نے اسے مال تجارت بنا دیا تو اس کی پیروی میں ہم نے بھی تعلیم کو کاروبار بنا لیا۔لیکن تجارت کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔مغرب کے سیکولر معاشروں نے بھی کچھ تجارتی اخلاق (Business Ehics) اپنا رکھے ہیں اور اسلام تو ہر شعبۂ زندگی کے لیے ہدایات دیتا ہے اور اخلاق اسلام کا اہم ترین شعبہ ہے اور تجارت کے بارے میں بھی اسلام نے خصوصی ہدایات دی ہیں لہٰذا ایک مسلمان اگر تعلیم

---

۱) صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب قولہ تعالیٰ و لقد سبقت کلمتنا لعبادنا المرسلین، ح ۷۴۵۸

۲) صحیح مسلم، کتاب الامارہ، باب من قاتل للریاء و السمعۃ استحق النار، ح ۱۹۰۵

کو تجارت بناتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس ضمن میں اسلامی تعلیمات پر عمل کرے مثلاً اسلام میں تجارت کا ایک بنیادی اصول دیانت داری ہے۔اس دیانت داری کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ وہی مال سپلائی کیا جائے جس کے پیسے لیے ہیں اور مال پورا دیا جائے اس میں ڈنڈی نہ ماری جائے۔قرآن حکیم نے اس پر سخت عذاب کی دھمکی دی ہے کہ انسان پیسے تو پورے لے لیکن جب خریدار کو تول یا ناپ کر دے تو اس میں کمی کرے۔اب مسلمان والدین کو اگر تعلیم خریدنی ہو تو انہیں یقیناً اپنی اولاد کے لیے ایسی تعلیم چاہیے جو دنیا و آخرت دونوں میں اس کے بچے کو کامیاب کرے یعنی اسلامی تعلیم۔لیکن اگر آپ اس کے بچے کو ایسی تعلیم دیں جو غیر اسلامی مغربی فکر و تہذیب کے اصول و اقدار پر مبنی ہو تو یہ ان والدین کے ساتھ دھوکہ ہے، ڈنڈی مارنا ہے اور اسے غلط نوعیت کا مال دینا ہے۔مسلمان والدین، خواہ خود کتنے ہی بے عمل یا بدعمل ہوں، کبھی اپنی اولاد کے لیے نہیں چاہتے کہ وہ چور اور ڈاکو بنے، جھوٹی، فریبی اور بددیانت ہو اور جہنم کی آگ میں جلے بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ ان کی اولاد نیک ہو، وہ اچھے انسان اور بہتر مسلمان بنیں اور دنیا و آخرت میں کامیاب ہوں۔اگر آپ مسلمان تاجر ہیں اور تعلیم فروخت کر رہے ہیں تو آپ پر فرض ہے کہ ان مسلمان والدین کے بچوں کو جو اپنی اولاد آپ کے پاس تعلیم کے لیے بھیج رہے ہیں وہ تعلیم فراہم کریں جو انہیں اچھا مسلمان اور اچھا انسان بنائے۔اگر آپ ایسا نہیں کرتے تو 'ویل للمطففین' (المطففین ۸۳:۱) تباہی ہے تجارت میں ڈنڈی مارنے والوں کے لیے...... کا اطلاق آپ پر کیوں نہ ہو؟ کہ آپ فیس تو پوری لیتے ہیں لیکن تعلیم ان کو اچھا مسلمان بنانے والی نہیں دیتے بلکہ انہیں مغرب زدہ تعلیم دیتے ہیں، انہیں 'کالا انگریز' بنانے والی تعلیم دیتے ہیں۔آپ انہیں ایسی تعلیم دیتے ہیں جو انہیں آخرت کی فکر نہیں دیتی، جو ان کی آخرت سنوارنے کا سبب نہیں بنتی...... تو یہ جرم کیوں نہیں؟ بحیثیت تاجر تعلیم آپ پر ویل للمطففین کا اطلاق کیوں نہ ہو؟

۳۔تقاضائے ایمان

ایک مسلمان کی آخری غایت یہ ہوتی ہے کہ اس کا اللہ اس سے راضی ہوجائے اور اپنی خوشنودی اور نعمتوں سے اسے نوازے۔ اس مقصد میں کامیابی کا نسخہ ہے ایمان اور عمل صالح اور یہ اسلام میں ہر شخص کی ذاتی ذمہ داری ہے کہ وہ نہ صرف خود دین پر عمل کرے بلکہ جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ 'کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ' یعنی جو لوگ اس کے ماتحت یا اس کی ذمہ داری میں ہیں وہ ان کے ایمان و عمل صالح کا بھی ذمہ دار ہے اور اس کے لیے وہ آخرت میں باقاعدہ جواب دہ ہوگا لہٰذا اگر آپ سکول کے مالک و منتظم یا پرنسپل ہیں تو آپ دینی لحاظ سے اس بات کے ذاتی طور پر مکلف ہیں کہ طلبہ کے لیے دین پر عمل کا نمونہ اور ماڈل بنیں اور انہیں اچھا اور باعمل مسلمان بنائیں۔ اگر آپ یہ نہیں کرتے تو کل قیامت کے دن آپ اللہ تعالیٰ کے حضور جوابدہ ہوں گے۔ لہٰذا سکول چلانے کو صرف پیشہ اور کاروبار سمجھنا اور اس میں اخروی ذمہ داری کا احساس نہ کرنا بڑے خسارے کی بات ہے۔ کل قیامت کے روز آپ ان طلبہ کی سلامتیٔ دین و ایمان اور عمل و اخلاق کے ذمہ دار ہوں گے اور آپ سے ان کے بارے میں پوچھا جائے گا اور آپ کو اس کے لیے جواب دہ ہونا پڑے گا اور اگر اس میں کوتاہی ہوئی تو ذاتی نماز روزہ آپ کے کام نہیں آئے گا اور اس کام سے غفلت آپ کے لیے وبال ثابت ہوگی۔

۴۔ناکامی کا خدشہ

کئی لوگ سوچتے ہیں کہ اگر انہوں نے اسلامی سکول کھولا تو شاید والدین اپنے بچے ان کے سکول میں نہ بھیجیں اور سکول ناکام ہوجائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری کمزوریوں، نالائقیوں، اسلامیت اور پاکستانیت کے تقاضوں کو نہ سمجھنے اور مغربی فکر و تہذیب سے مرعوبیت اور اس کی پیروی میں ترقی کا راز پنہاں سمجھنے کی غلط فہمی کی وجہ سے ہمارے ہاں کئی لوگ تعلیم کی مغربیت کے قائل ہیں اور اسے ہی کامیابی کی کلید سمجھتے ہیں...... لیکن حقیقت یہ ہے کہ کوئی سکول آج تک اس لیے ناکام نہیں ہوا کہ وہ اسلامی ہے بلکہ سیکڑوں لوگ اسلام کا نعرہ لگا کر اپنے سکول سسٹم کامیابی سے چلا رہے ہیں حالانکہ وہ کچھ زیادہ ڈیلیور نہیں کر رہے۔

ہاں! کئی سکول ناکام ہوجاتے ہیں اپنی کمزور انتظامی پالیسیوں کی وجہ سے اور نام لگتا ہے اسلامی پالیسیوں کا کہ معاشرہ اسلامی سکولوں کو قبول نہیں کرتا۔ اس کے برعکس ہماری رائے اور مشورہ یہ ہے کہ اگر سکول کی انتظامی پالیسیاں پرکشش ہوں، امتحانی نظام فعال ہو، اساتذہ لائق اور محنتی ہوں (ان کی تنخواہ

اچھی ہو) سکول کا رزلٹ اچھا آئے، ہم نصابی سرگرمیاں موثر ہوں، والدین سے رابطہ ہو۔ بلڈنگ اور فرنیچر جاذب اور خوبصورت ہو......تو سکول، ان شاء اللہ، کامیاب رہے گا اور اسلامی اقدار سے وابستگی سونے پر سہاگہ ثابت ہوگی اور ہرگز منفی اثرات نہ ڈالے گی لیکن اگر آپ کا سکول ان خوبیوں سے محروم ہو اور آپ صرف اسلام کا نام بیچنا چاہیں تو ظاہر ہے یہ بات نہیں چل سکتی۔

خلاصہ یہ کہ یہ محض وہم ہے کہ ایک عام سکول یا مغرب زدہ سکول چلانا آسان ہے اور اسلامی سکول چلانا مشکل ہے یا اس کے ناکام ہونے کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں۔

چند عملی اقدامات

اب ہم چند ایسے اقدامات کا ذکر کرتے ہیں جنہیں اپنا کر اسلامی سکول، موجودہ نظام تعلیم کی ان خرابیوں کے باوجود جنہیں حکومت یا معاشرے کے دباؤ کی وجہ سے اپنانے پر وہ اپنے آپ کو مجبور سمجھتے ہیں، اسلامی سپرٹ اور مقاصد کو قابل لحاظ حد تک حاصل کر سکتے ہیں:

پرائمری سکول لیول

۱۔ کوشش کریں کہ پری سکول ایک سال سے زیادہ کا نہ ہو جس کا مقصد بچے کو سکول سے مانوس کرنا ہو، کھیل کود کے دوران دلچسپ انداز میں کہانیوں اور مختلف علمی سرگرمیوں کی صورت میں بچوں کو نوشت و خواند سکھا دی جائے تا کہ وہ پہلی جماعت میں باقاعدہ تعلیم کا آغاز کر سکیں۔

۲۔ بچے کو تین چار سال کی عمر میں چار زبانیں (گھر میں مادری زبان اور سکول میں اردو، انگریزی اور عربی) بیک وقت سکھانا علمی اور فنی لحاظ سے سخت نقصان دہ ہے اور پوری کوشش کرنی چاہیے کہ ان کو آگے پیچھے کر کے کسی طرح تدریج کی راہ پر ڈالا جائے۔ زبانوں کے لحاظ سے ہماری یہاں ایک خاص تجویز ہے اور وہ یہ کہ ہمارے بچوں کی بہت بڑی اکثریت کا قرآن حکیم کا تلفظ ساری عمر ٹھیک نہیں ہو پاتا (بشمول بہت سے حفاظ اور دینی مدارس کے طلبہ کے) اس کا حل یہ ہے کہ پریپ میں بچے کو انگریزی اور اردو سکھانے سے پہلے کم از کم ابتدائی تین ماہ (اور بہتر یہ ہے کہ چھ ماہ تک) قرآنی قاعدہ کسی ایسے استاد سے پڑھوا دیا جائے جو تجوید کا ماہر ہو اور اس کے اپنے مخارج ٹھیک ہوں۔ تجوید کے قواعد بتانے یا رٹنے کی ضرورت نہیں، عملی مشق کافی ہے۔ اس سے مسلمان بچے کا قرآن حکیم کا تلفظ ساری زندگی کے لیے ٹھیک ہو جائے گا، ان شاء اللہ، کیونکہ اس عمر میں بچے کی زبان میں لوچ ہوتا ہے اور متواتر مشق

سے وہ صحیح مخارج نسبتاً آسانی سے سیکھ سکتا ہے۔

۳۔ پرائمری سطح پر قرآن حکیم کا نصاب یہ ہو:

ا: ابتدائی قاعدے سے شروع کر کے پانچویں کے آخر تک ہر بچے کو ناظرہ قرآن پڑھا دیا جائے۔

ب: اس دوران آخری بیس سورتیں (اور نماز) ترجمے کے ساتھ زبانی یاد کرادی جائے۔

ج: تیسری جماعت سے بچے کو آسان قرآنی عربی دلچسپ انداز میں پڑھانی شروع کر دی جائے (قواعد رٹنے کی بالکل ضرورت نہیں) تاکہ بچے بتدریج قرآن کی زبان کو سمجھنے کے قابل ہوجائیں۔

د: ہر سال پندرہ بیس مختصر احادیث جن کا تعلق استحکام عقیدہ وتعمیر شخصیت ...... سے ہو، طلبہ کو مع ترجمہ وتفہیم زبانی یاد کرادی جائیں۔

ھ: اس مضمون کو مطالعۂ قرآن وحدیث کا نام دیا جاسکتا ہے اور اس کے لیے روزانہ پہلا پریڈ مختص کیا جاسکتا ہے۔ اسلامیات کا پریڈ اس کے علاوہ ہوگا۔

۴۔ مطالعہ اسلام (یا اسلامیات) کا حکومتی مجوزہ نصاب خاصا کم اور ناقص ہے جس کی توسیع اور جامعیت کی ضرورت ہے۔ مارکیٹ میں اس کے لیے خاصا مواد اردو اور انگریزی میں موجود ہے اور منتخب کیا جاسکتا ہے۔ تعلق باللہ کو مضبوط کرنے کے لیے اللہ کی محبت وخشیت اور آخرت کی فکر پیدا کرنے والا اور شخصیت کی تعمیر کرنے والا مواد البتہ کم ہے جس کی تلاش وجستجو اور تدوین نو کی ضرورت ہے۔

وضو اور نماز کا طریقہ زبانی یاد کروا دینا کافی نہیں۔ اس کی باقاعدہ عملی مشق کمرۂ جماعت میں یا سکول میں کی جانی چاہیے۔ اسی طرح جب صبح شام اور روزمرہ کی دعائیں یاد کرائی جائیں تو ان کی عملی مشق اور حقیقی زندگی میں ان پر عمل کی عادت کی نگرانی متواتر کی جائے تاکہ بچے ان پر عمل کے عادی ہوجائیں اور وہ ان کی شخصیت کا حصہ بن جائے۔

۵۔ ضروری ہے کہ اساتذہ کا اپنا طرزِ عمل خیرخواہانہ اور نمونے (ماڈل) کا ہو اور وہ شفقت ومحبت سے بچوں کی تربیت کریں۔ مار پیٹ اور سختی کی ہرگز اجازت نہیں ہونی چاہیے۔

۶۔ کوشش کریں کہ اس مرحلے پر طلبہ کی اردو زبان پر گرفت مستحکم ہوجائے تاکہ اگر خدانخواستہ وہ

اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکیں تو بھی مستقبل میں نوشت وخواند کے محتاج نہ رہیں اور اردو اچھی ہونے کی وجہ سے ذاتی زندگی میں مطالعہ کے ذریعے مزید علم حاصل کر سکیں (یاد رہے کہ ہمارے ہاں پرائمری میں ڈراپ آؤٹ ریٹ ٪ ۵۰ کے قریب ہے یعنی نصف بچے بوجوہ سکول چھوڑ جاتے ہیں)

۷۔ اضافی مواد تدریس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز زندگی کو بطور ماڈل اور صحابہ کرام کی سوانح کو بطور ہیروز ضرور زیر مطالعہ لایا جائے تا کہ بچوں کے ذہن میں آئیڈیلز اور ماڈلز واضح ہو جائیں۔

مڈل و ہائی سکول لیول

مطالعہ قرآن وحدیث: آٹھویں تک آخری پارہ زبانی یاد کرادیا جائے۔ چھٹی جماعت سے ترجمۂ قرآن کا آغاز کر کے دسویں تک اسے مکمل کر لیا جائے۔ قرآنی عربی دلچسپ اور ہلکے پھلکے انداز میں دسویں تک جاری رکھی جائے تا کہ طلبہ قرآن حکیم پڑھ اور سن کر با آسانی سمجھ سکیں۔ ہر سال چالیس حدیثوں اور توسیع شدہ اسلامیات کی تدریس بھی جاری رکھی جائے۔

مخلوط تعلیم: اگر سکول میں تعلیم مخلوط ہو تو مقدور بھر کوشش کی جائے کہ طلبہ وطالبات کا اختلاط کم سے کم ہو (مثلاً کمرہ جماعت میں انہیں الگ الگ بٹھایا جائے۔ ان کی تربیت کی جائے کہ وہ آتے جاتے، نوٹس تیار کرتے ہوئے، چائے کے لیے جاتے ہوئے الگ الگ گروپوں میں رہیں......وغیرہ) اور بچیوں کو سمجھایا جائے کہ حیاء سب سے قیمتی زیور ہے جس کی حفاظت اور افزائش انتہائی ضروری ہے۔

تربیت طلبہ: تربیت تعلیم کی غایت، اس کا حاصل اور اصل مقصود ہے لہٰذا تعلیم سے اہم تر ہے۔ یہ بھی تعلیم کی طرح ایک ہمہ جہت عمل ہے جس میں اساتذہ، طلبہ، نصاب، تعلیمی انتظامیہ، ماحول سب کا ایک کردار ہے اور سب کے اس مقصد کے لیے مل کر کام کرنے سے ہی اچھے نتائج نکل سکتے ہیں تاہم اس کے لیے خصوصی کوششیں بھی ضروری ہیں۔ تربیت کی اصطلاح دراصل قرآنی اصطلاح تزکیۂ نفس کی متبادل ہے جس میں دو پہلوؤں پر فوکس کیا جاتا ہے۔ ایک ترک رذائل اور دوسرے اکتساب فضائل یعنی بری خصلتوں کو ترک کیا جائے (جیسے گالی دینا، جھگڑا کرنا، چوری کرنا......) اور اچھی عادتوں کو فروغ دیا جائے (جیسے صاف ستھرا رہنا، نظم وضبط، وعدہ پورا کرنا، نماز پڑھنا......وغیرہ)۔

تربیت کمیٹی: اس کے لیے ہماری تجویز یہ ہے کہ ہر سکول میں ایک تربیت کمیٹی بنائی جائے اور

پرنسپل، وائس پرنسپل یا اسلامیات کا استاد اس کا سربراہ ہو۔ تعلیمی سال کے شروع میں کئی اجلاس منعقد کر کے سال بھر کا تربیتی لائحہ عمل بنا لیا جائے۔

والدین سے رابطہ: تربیت کے لیے والدین سے رابطہ ایک اہم عنصر ہے۔ آپ والدین کو بلا کر بتائیے کہ سکول ان کے بچوں کی تربیت کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے یہ اور یہ اقدامات کرنا چاہتا ہے وہ یقیناً خوش ہوں گے۔ تربیت کے ضمن میں ان سے مشورے طلب کیے جائیں، ان کے بچے کو کوئی تربیتی مسئلہ درپیش ہو تو انفرادی طور پر انہیں بلائیے، اس کا بھی خوشگوار اثر پڑے گا۔

تربیت اساتذہ: سکول میں تعلیم و تربیت کا انحصار بڑی حد تک اساتذہ پر ہوتا ہے لہٰذا اساتذہ کی تربیت بہت ضروری ہے۔ سکول ڈائریکٹر/ پرنسپل کو بحیثیت ٹیم لیڈر اس کے لیے پہلے خود تیاری کرنی چاہیے اور پھر اپنے اساتذہ کی تربیت کرنی چاہیے۔ اس کے لیے سٹڈی سرکل میں اجتماعی مطالعہ کیا جا سکتا ہے، خصوصی ہفتہ وار میٹنگ رکھی جا سکتی ہے، خصوصی موضوعات پر لیکچر دیے جا سکتے ہیں...... وغیرہ۔

ہم نصابی سرگرمیاں: ہم نصابی سرگرمیاں تربیت کا ایک بنیادی اور بڑا ذریعہ ہیں لہٰذا نصابی سرگرمیوں کو اسلامی تناظر میں سرانجام دینا ضروری ہے۔ یہ کام کیسے کیا جائے؟ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے پروفیسر سید سلیم صاحب کا کتابچہ 'درس گاہ کی ہم نصابی سرگرمیاں'۔ 'طلبہ کی تربیت کیسے کی جائے؟' کے موضوع پر دیکھیے ہماری دو کتابیں: 'تعلیمی ادارے اور کردار سازی' اور 'تربیت طلبہ مینوئل و گائیڈ'۔ تعلیم و تربیت سے متعلق ہمارے اصلاحی نقطۂ نظر سے آگاہی کے لیے ہماری کتاب 'ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل' دیکھ لینا بھی مفید رہے گا (یہ کتابیں مکتبہ البرہان سے منگوائی جا سکتی ہیں)۔

اگر 'اسلامی سکول' موجودہ خرابیوں (مثلاً انگریزی ذریعہ تعلیم، لازمی انگریزی، مخلوط تعلیم، غیر ملکی امتحانات، غیر مناسب نصابی کتب، انگریزی یونیفارم...... وغیرہ) پر قابو نہ بھی پا سکیں لیکن ہماری مندرجہ بالا تجاویز پر عمل کریں تو توقع ہے کہ ان کا سکول نظریاتی طور پر مقابلتاً کچھ بہتر خدمات انجام دے سکے گا۔

اے اللہ! جو میرے مقدر میں نہیں لکھا اس کی کوشش یا تمنا میں مجھے مبتلا نہ

کراور جو تقدیر میں لکھ دیا ہے اسے میرے لیے آسان بنادے۔

یا اللہ! مجھے اس کام کے لیے فرصت فراہم کر جس کے لیے تو نے مجھے پیدا کیا اور اس کام میں مشغول نہ ہونے دے جس کی ذمہ داری تو نے خود اٹھا رکھی ہے۔

میرے مولا! مجھے شکر کرنے کی توفیق عطا فرما اور ایمان پر موت عطا فرما۔ آمین یارب العالمین (امین اشعر، کراچی)

تعلیم و تربیت

چوہدری رفاقت علی ☆

علم الاسماء (۳)

اور اب بعض انگریزی تفاسیر کے اقتباسات ملاحظہ ہوں:

And He taught Adam the names of all things:

1- "The names of things:" according to commentators means the inner nature and qualities of things, and things here would include feelings. The particular qualities of feelings which were outside the nature of angles were put by Allah into the nature of man. Man was thus able to love and understand love, and thus plan and initiate, as becomes the office of vicergent. (ABDULLAH YUSUF ALI)

2- And He imparted unto Adam the names of all things:

Lit. "all the names". The term *ism* ("name") implies, according to all phiologists, an expression "conveying the knowledge [of a thing]...... applied to denote a substance or an accident or an attribute, for the purpose of distinction" (Lane IV, 1435): in philosophical terminology, a "concept". From this it may

legitimately be inferred that the "knowledge of all names". denotes here man's faculty of logical definition and, thus, of conceptual thinking. That by "Adam" the whole human race is meant here becomes obvious from the preceding reference, by the angles, to "such as will spread corruption on earth and will shed blood", (MUHAMMAD ASAD)

3) And He taught Adam the names all of them...... (of all things, and infused into his heart the knowledge of their Properties). (ABDUL MAJID Darya Abadi)

☆ ماہر تعلیم، لاہور، 0333-4575158

مولانا فضل الرحمن اپنی تفسیر 'فضل القرآن' میں 'علم الاسماء' کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ

اسی بنا پر فرشتوں نے عرض کیا: اے رب! تو اس کو زمین میں خلیفہ بنائے گا جو اس میں فساد کرے گا اور خون بہائے گا؟ تفاسیر میں یہ بھی منقول ہے کہ چونکہ فرشتوں نے مشاہدہ کیا تھا کہ انسان سے پہلے جنوں کی جب زمین میں تخلیق ہوئی تو انہوں نے وہی کچھ کیا جس کا ذکر فرشتوں نے بارگاہِ الٰہ میں کیا۔

اللہ تعالیٰ نے عملی طور پر اپنی حکمت کا مظاہرہ یوں فرمایا کہ آدم علیہ السلام کو ان چیزوں کے علم سے نوازا دیا جن کا فرشتوں کو علم نہ تھا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے حضرت انسان کو جو شرفِ اعلیٰ ملا ہے، وہ علم کی وجہ سے ہے۔ یہاں ایک بڑا ہی خوبصورت پہلو نمایاں کیا گیا ہے کہ جس چیز یا مسئلے کے بارے میں علم نہ ہو اس میں معذوری ظاہر کر لینا بہتر ہے جیسا کہ فرشتوں نے کہا جن چیزوں کے بارے میں وہ لاعلم تھے اس کا انہوں نے اقرار کر لیا اور اللہ تعالیٰ کے علیم وحکیم ہونے پر انہوں نے گواہی دے دی۔ انسان کی سب سے بڑی جہالت یہ ہے کہ نہ جاننے کے باوجود اپنے آپ کو سب کچھ جاننے والا ظاہر کرے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کا معمول تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ان سے کسی ایسی چیز کے متعلق سوال کرتے جس کا انہیں علم بھی ہوتا تو وہ پھر بھی کہتے 'اللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ' (اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں)۔

زمین میں انسانی خلافت کے بارے میں علمائے امت نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ مسلمانوں کا خلیفہ کوئی عورت نہیں ہو سکتی۔ خلافت کے لیے پہلی شرط اس کا مرد ہونا ہے۔ مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ آزاد، بالغ، عقل مند، عادل، مجتہد، سلیم الاعضاء، فنون جنگ اور رائے سے باخبر ہونا بھی لازمی ہے۔

سورۃ صٓ: ۲۶ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْھَوٰی فَیُضِلَّکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اِنَّ الَّذِیْنَ یَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ لَھُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌم بِمَا نَسُوْا یَوْمَ الْحِسَابِ۔

'اے داوٗد علیہ السلام! ہم نے تمھیں زمین مین خلیفہ بنایا ہے۔ پس لوگوں کے درمیان حق کے مطابق فیصلے کرو اور خواہشات کی پیروی مت کرنا۔ ایسا کرو گے تو تمہاری خواہشات تمہیں اللہ کی راہ سے ہٹا دیں گی، بے شک جو اللہ کی راہ سے ہٹ جاتے ہیں، ان کے لیے سخت عذاب ہوگا، اس لیے کہ وہ یوم حساب کو بھول گئے۔'

اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ خلیفہ نہ صرف مسلمان مرد ہوگا بلکہ اس کو قرآن وسنت کے مطابق فیصلے کرنے ہوں گے۔ ان فیصلوں میں اس کی نفسانی خواہشات کا کوئی عمل دخل نہ ہوگا۔ اگر دنیا میں اس کا کوئی حساب لینے والا نہ ہوگا تو قیامت کے روز اس کو اپنے کیے کا حساب دینا ہوگا۔ پھر راہ حق سے ہٹ جانے اور خواہشات کے مطابق عمل کرنے کی وجہ سے زبردست عذاب ہوگا۔ آج کل کئی اسلامی ملکوں میں قرآن وسنت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے عورتوں کو سربراہ بنایا جارہا ہے۔ شرح صدر کے لیے میری کتاب 'اسلام میں عورت کی سربراہی کا کوئی تصور نہیں' دیکھی جاسکتی ہے۔

حل لغات

{لِلْمَلٰٓئِکَۃِ} میں لام حرفِ جر اور ملائِکۃ ملک کی جمع ہے۔

{جَاعِلٌ} جَعَلَ یَجْعَلُ (ف) سے اسم الفاعل ہے اور یہاں یہ خالق کے معنی میں آیا ہے یعنی 'پیدا کرنے والا' جیسا یا ٹھیک کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اگر اس کے بعد حرف جر 'علیٰ' آجائے تو معنی ہوتے ہیں 'چڑھنے اور قرار پانے' کے اور اگر اس کے بعد حرف جر 'الیٰ' آجائے تو پھر معنی ہوں گے متوجہ ہونے اور قصد کرنے کے۔ یہاں اِسْتَوٰی کے بعد الی ہے لہٰذا معنی ہیں: ''پھر اللہ تعالیٰ آسمان کی طرف متوجہ ہوا'

وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْھَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْھَا وَیَسْفِکُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ [30:2] وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّھَا ثُمَّ عَرَضَھُمْ عَلَی الْمَلٰٓئِکَۃِ فَقَالَ اَنْبِئُوْنِیْ بِاَسْمَآءِ ھٰٓؤُلَآءِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ [31:2] قَالُوْا سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا

اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ [32:2]

'اور جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا: میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں، تو فرشتوں نے عرض کیا: کیا تو زمین میں اس کو خلیفہ بنائے گا جو اس میں فساد کرے گا اور خون بہائے گا؟ حالانکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور تیری عظمت و بزرگی کا ذکر کرتے ہیں۔ (اللہ نے) فرمایا: میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اور اللہ نے آدم (علیہ السلام) کو تمام چیزوں کے نام سکھادیے۔ پھر ان کو فرشتوں پر پیش کرتے ہوئے فرمایا: اگر تم سچے ہو تو ان چیزوں کے مجھے نام بتاؤ۔ فرشتوں نے عرض کیا: تو پاک ہے ہمیں تو اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے ہمیں عطا فرمایا بے شک تو ہی جاننے والا حکمت والا ہے۔''

تشریح

اللہ تعالیٰ نے زمین میں انسانِ اوّل (آدم علیہ السلام) کی تخلیق سے پہلے جو اعلان فرمایا اور اسے سن کر فرشتوں نے جو عرض کیا اور علیم وحکیم نے جو جواب دیا، ان آیات میں اس کا ذکر ہوا ہے۔

ان آیات سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے خالق و مالک ہونے کا چونکہ ذکر فرمایا، اس لیے انسان کی تخلیق کی جس حکمت کے تحت ابتدا ہوئی اس کی بھی وضاحت فرمادی۔ اللہ تعالیٰ کا اعلان سنتے ہی فرشتوں نے جو سوال کیا، وہ اعتراض کے طور پر نہیں تھا، بلکہ وہ جاننا چاہتے تھے کہ ہم تو دن رات اس کی حمد وتقدیس میں لگے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود انسان کی تخلیق کی کیا ضرورت ہے؟ رہی بات یہ کہ ان کو کیسے معلوم ہوا کہ انسان اور اس کی اولاد زمین میں فتنہ وفساد برپا کرے گا؟ اس کے جواب میں امام قرطبیؒ نے قتادہؒ سے نقل کیا ہے:

'کَانَ اللّٰہُ اَعْ ☐ لَمَھُمْ اَنَّہٗ اِذَا کَانَ فِی الْاَرْضِ خَلْقٌ اَفْسَدُوْا فِیْھَا وَ سَفَکُوْا الدِّمَآءَ'

'اللہ تعالیٰ نے خود ہی ان کو بتایا تھا کہ جب زمین میں مخلوق ہوگی تو وہ اس میں فساد کرے گی اور خون بہائے گی۔'

وَ عَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ کُلَّھَا (علم الاسماء) کے بارے

صحیح بخاری (باب ۵۶۳) حدیث نمبر ۱۵۸۷۔

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا...... قیامت کے دن مسلمان کہیں گے بہتر ہے آج بارگاہ ایزدی میں کسی کی سفارش لائی جائے چنانچہ (سوچ بچار کر کے حضرت آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے۔ان سے کہیں گے۔آپ سب لوگوں کے باپ ہیں۔اللہ نے اپنے ہاتھ سے آپ کو بنایا۔اللہ تعالیٰ کے دربار میں ہماری کچھ سفارش کر دیجیے کہ وہ ہمیں اس مصیبت کی جگہ سے نکال کر ارام دے۔وہ کہیں گے، میں اس لائق نہیں اور اپنی لغزش یاد کر کے، پروردگار کے حضور حاضر ہونے سے شرم کریں گے۔کہیں گے تم لوگ نوح علیہ السلام کے پاس جاؤ۔وہ پہلے پیغمبر ہیں جو زمین والوں کی طرف بھیجے گئے۔یہ لوگ نوح علیہ السلام کے پاس جائیں گے (ان سے عرض کریں گے) وہ کہیں گے میرا یہ منہ نہیں اور اپنی یہ لغزش کہ پروردگار سے وہ بات چاہنا جس کا علم نہیں، یاد کر کے شرمندہ ہوں گے۔کہیں گے تم اللہ کے خلیل (ابراہیم علیہ السلام) کے پاس جاؤ۔یہ لوگ ان کے پاس جائیں گے۔ان سے عرض کریں گے میں اس لائق نہیں۔تم موسیٰ کے پاس جاؤ۔وہ ایسے (معزز) بندے ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا، اُن پر تورات نازل کی۔آخر یہ لوگ ان کے پاس جائیں گے ان سے عرض کریں گے۔وہ کہیں گے میں اس لائق نہیں۔دنیا میں ناحق خون یاد کر کے اللہ تعالیٰ سے شرم محسوس کریں گے اور کہیں گے۔تم عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ۔وہ اللہ کے بندے، رسول، کلمہ اور روح ہیں چنانچہ لوگ ان کے پاس جائیں گے اور ان سے عرض کریں گے۔وہ کہیں گے میں اس لائق نہیں۔محمدؐ کے پاس جاؤ وہ (نہایت مکرم ومعزز) بندے ہیں۔جن کی اگلی پچھلی لغزشیں اللہ تعالیٰ نے سب معاف کر دی ہیں۔آخر یہ سب لوگ میرے پاس آئیں گے اور میں وہاں سے چل کر پروردگار کے حضور میں حاضر ہونے کی اجازت چاہوں گا۔مجھے اجازت ملے گی۔میں اپنے پروردگار کو دیکھتے ہی سجدے میں گر پڑوں گا۔اللہ تعالیٰ جب تک چاہے گا مجھے سجدے میں پڑا رہنے دے گا۔پھر ارشاد ہوگا، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنا سر اُٹھا اور مانگ (کیا مانگتا ہے) ہم دیں گے۔کچھ کہہ ہم سنیں گے، جو سفارش کرے گا۔ہم قبول کریں گے۔میں سر اُٹھا کر (پہلے) اپنے مالک کی ایسی تعریف کروں گا جو وہ (اس وقت) مجھے سکھائے گا۔پھر بندگان خدا کی سفارش کروں گا۔لیکن سفارش کی ایک حد مقرر کر دی جائے گی۔میں ان لوگوں کو بہشت میں داخل کرا دوں گا۔پھر اللہ تعالیٰ کے پاس آؤں گا......اور اسے دیکھتے ہی سجدے میں گر پڑوں گا ویسا ہی حال گزرے گا جیسے پہلے ہوا تھا۔پھر سفارش کی ایک حد مقرر کر دی جائے گی۔میں ان لوگوں کو بھی بہشت میں پہنچا دوں گا۔پھر تیسری بار اپنے مالک کے پاس حاضر ہوں گا۔(پھر ایک حد مقرر ہوگی) پھر چوتھی بار حاضر ہوں گا اور عرض کروں گا۔پروردگار اب تو دوزخ میں وہی لوگ رہ گئے ہیں جو از روئے قرآن دوزخ میں مقید رہنے کے لائق ہیں

اور جنہیں ہمیشہ دوزخ میں رہنا چاہیے۔

امام بخاریؒ کہتے ہیں قرآن کی رو سے دوزخ میں ہمیشہ رہنے والے ہی مراد ہیں، جن کی شان میں **'خالدین فیھا'** آیا ہے۔

گویا 'علم غیب' سارے کا سارا، اللہ رب العزت ہی کے پاس ہے جو علم جتنا چاہتا ہے، جس کو چاہتا ہے عطا فرما دیتا ہے۔ ایک وہ علم جو 'خلافتِ ارضی' کا سونپنے سے پہلے کا ہے۔ جو آدم علیہ السلام کو ودیعت کیا گیا، جسے 'علم الاسماء' کہتے ہیں اور دوسرا وہی 'غیب کا علم' جو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز لوگوں کی شفاعت کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائیں گے۔ 'دُعا کی صورت' میں اور شفاعت کی صورت میں'

'علم الاسماءٔ' علامہ محمد اقبال شاعرِ مشرق کی نظر میں

یہ ہیں سب ایک ہی مسالک کی جستجو کے مقام
وہ جس کی شان میں آیا ہے علم الاسما!
مقامِ ذکر کمالات رومی و عطار
مقامِ فکر مقالات بوعلی سینا!
مقامِ فکر ہے پیمائشِ زمان و مکان
مقامِ ذکر ہے سبحان ربی الاعلیٰ

اقبالؒ اس نظم میں، ان کے مفہوم کو اپنے خاص انداز میں بیان کرتے ہیں: ذکر وفکر دراصل اس سالک یا مومن کی روحانی ترقی کی منزلیں ہیں جس کی شان میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے **وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا** (اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو سب چیزوں کے نام سکھا دیئے۔ (البقرہ:۳۱)

یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی فطرت میں جستجو اور تحقیق کا مادہ ودیعت فرما دیا۔ مقامِ ذکر کیا ہے؟ اس کا جواب اقبالؒ نے کس قدر دل پذیر انداز میں دیا ہے:

جب مومن مقام ذکر پر فائز ہوتا ہے تو رومیؒ اور عطارؒ بن جاتا ہے۔ یعنی روحانیت میں بلند مرتبہ حاصل کر لیتا ہے اور جب آدمی مقامِ فکر تک پہنچ جاتا ہے تو بوعلی سینا بن جاتا ہے۔

مقالات بوعلی سینا سے مراد اس کی فلسفیانہ تصانیف ہیں۔ رومی سے مراد اقبال کے روحانی مرشد

حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ ہیں جن کی مثنوی حقائق و معارف کا ایک زبردست خزانہ ہے۔ چنانچہ علامہ نے مجھ سے (مراد شرح ضربِ کلیم کے مؤلف پروفیسر یوسف سلیم چشتی) ایک مرتبہ کہا تھا 'اگرچہ میں نے یورپ کا سارا فلسفہ پڑھا ہے لیکن دراصل فائدہ مجھ کو دو ہی کتابوں سے ہوا۔ ایک قرآن مجید دوسری مثنوی۔ عطار سے حضرت شیخ فرید الدین عطار مراد ہیں جن کی مثنوی 'منطق الطیر' بہت مشہور ہوئی۔ یہ اسلامی تصوف کے بہت بڑے ماہر ہیں (جاری ہے)۔

کامیاب آدمی وہ ہے جو اپنے اوپر پھینکے گئے پتھروں سے
اپنے فکر و عمل کی مستحکم بنیاد کھڑی کر دے

اتحاد امت

ڈاکٹر محمد علی ☆

پاکستان کی دینی قوتوں میں اتحاد

وقت کی اہم ترین ضرورت

جب سے انسانی سوسائٹی وجود میں آئی ہے دو چیزیں ناممکنات میں شامل رہی ہیں، ایک یہ کہ پورا انسانی معاشرہ مکمل طور پر بدی میں ڈھل گیا ہو، دوسرے یہ کہ پوری آبادی نیکی کامل کی مظہر بن گئی ہو۔ نہ بدی کبھی نیکی کو بالکل مٹا سکی اور نہ نیکی نے کبھی بدی کا وجود یکسر ختم کیا ہے۔ بلکہ ہوتا یہ آیا ہے کہ بدی اور نیکی میں مسلسل معرکہ برپا رہا، بدی نے ہر دور میں غالب آنے کی کوشش کی اور نیکی نے بھی غلبہ پانے کی تدبیریں کیں، کبھی معاشرے پر بدی نے تسلط حاصل کرلیا اور کبھی نیکی نے غلبہ پالیا۔ آج بھی پوری دنیا میں کچھ اسی نوع کی کشمکش جاری ہے۔ ایک طرف بدی کی کوشش ہے کہ وہ انسانی آبادی کو اپنے رنگ میں رنگ لے اور دوسری جانب نیکی کی خواہش ہے کہ وہ لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر چلے۔

روئے زمین اس وقت بدی اور نیکی کی آخری تو نہیں البتہ بہت بڑی لڑائی کے لیے تیار نظر آرہی ہے۔ پوری دنیا میں قال اللہ وقال الرسول ﷺ کی صداؤں سے گونجتے ہوئے ہزاروں مدارس، نمازیوں سے بھری ہوئی مساجد اور حج بیت اللہ کے موقع پر اجتماعِ امت کا نظارہ، جہاں امتِ مسلمہ کی عظمت اور غلبہ اسلام کا پتہ دیتے ہیں، وہیں عالمِ کفر اپنے پورے لاؤ لشکر سمیت اس غلبہ اور سالمیتِ

اسلام کو مٹانے کی تیاری میں مصروف عمل ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اِس شدید ترین معرکہ میں اہلِ خیر، باطل اور طاغوتی طاقتوں سے نبرد آزما ہونے اور ان سے پنجہ آزمائی کرنے کے لیے کیا لائحہ عمل اپناتے ہیں؟ ان حالات میں کیا مسلمانانِ عالم پورے اسلامی قلعے کی حفاظت کرتے ہیں یا اپنی اپنی فصیل پر پہرہ دیتے ہیں؟ اسلامی مرکز کو بچاتے ہیں یا محض اپنے در و دیوار کی حفاظت کرتے ہیں؟ شاخِ نشیمن کی فکر کرتے ہیں یا سارے چمن کی رکھوالی کرتے ہیں؟

پاکستان میں جس طرف بھی نظر دوڑائیں ہمیں نیکی کی بہار نظر آتی ہے۔ کبھی دعوتِ اسلامی کا اجتماع منعقد ہوتا ہے جس میں لاکھوں فرزندانِ توحید اور عاشقانِ رسول ﷺ شریک ہوتے ہیں اور اپنے دامنوں کو توحید و سنت کے مدنی پھولوں سے بھرتے ہیں۔ کبھی 'تنظیمِ اسلامی' کا عظیم الشان پروگرام انعقاد پذیر ہوتا ہے جس میں ہزاروں سنجیدہ اور مخلص احباب شریک ہوتے ہیں۔ کبھی 'جماعت اہل سنت' کا عالمگیر کنونشن ہوتا ہے جس میں دنیا بھر سے مسلمان شرکت کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ کبھی 'جماعۃ الدعوۃ' کا اجتماع ہوتا ہے، جس میں لاکھوں پرستارانِ توحید شامل ہوتے ہیں اور توحیدِ خالص کا پرچار کرتے ہیں۔ کبھی عالمِ اسلام کی منظم ترین تحریک 'جماعت اسلامی' کے کارکن کندھے سے کندھا ملائے ہاتھوں کی زنجیر بنا کر مسلمانانِ عالم سے اخوت و محبت اور ملی یکجہتی کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ کبھی تطہیرِ قلب اور تزکیۂ نفس کے لیے ذکر و اذکار کی محفلیں سجائی جاتی ہیں، جن میں لوگوں کے اللہ اور اس کے رسول محمد ﷺ کے ساتھ کمزور ہوتے تعلق کو پھر سے مضبوط کیا جاتا ہے۔ کبھی 'تبلیغی جماعت' کا بین الاقوامی سہ روزہ اجتماع ہوتا ہے جس کے عالمگیر اور پرہجوم ہونے میں اب کسی اپنے اور پرائے کو شک نہیں رہا۔

☆ پروفیسر آف ٹیکنالوجی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

ذرا غور کریں کہ:

'دعوتِ اسلامی' اتباعِ سنت ﷺ کا پرچار کرے، 'تنظیم اسلامی' خلافت کا منشور اَز بر کرائے، 'جماعت اہلِ سنت' سیدی مرشدی یا نبی ﷺ یا نبی ﷺ کے نعروں سے فضا کو بھر دے، 'جماعتِ اسلامی' کے منظم کارکن ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اتحادِ اسلامی اور وحدت امت کا اظہار کریں۔ 'جماعۃ الدعوۃ' جہاد کا جذبہ بیدار کرے، اور 'تبلیغی جماعت' کے سہ روزہ پروگرام میں تین دِن تک خدا اور رسول ﷺ کے نام کے سوا دوسرا نام لب پہ نہ آئے اور نہ کانوں میں اُترے۔

لیکن اس سب کے باوجود استعمار کی آلہ کار ہماری نام نہاد حکومتیں بھی اپنے ایوانوں میں خوش باش اور مطمئن رہیں۔ رشوت ستانی، لوٹ کھسوٹ اور سود کا بازار گرم ہو، میڈیا عریانی وفحاشی کے مناظر دکھانے میں کوئی حجاب اور خوف محسوس نہ کرے، زنا کاری ایک فیشن بنتا جائے، سیاسی غلبہ اور تسلط ان لوگوں کا رہے جن کے نامۂ اعمال میں سوائے کرپشن، ضمیر فروشی، اور اخلاقی ذلتوں کے اور کچھ درج نہ ہو۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ کوتاہی کہاں پر ہورہی ہے۔ کس چیز کی کمی ہے؟ سنتوں کا احیاء اپنی جگہ مستحسن، جہاد کی تبلیغ اپنی جگہ مناسب، کلمہ کی تصحیح اور نماز کی تلقین اپنی جگہ برحق، عشق رسول ﷺ کا فروغ اپنی جگہ بہت مبارک اور دعوت کا کام اپنی جگہ مسعود ومحمود، لیکن اس وقت ضرورت اس اسلامی انقلاب کی ہے جس کی بنیاد اوّل پیغمبر اعظم و آخر محمد رسول اللہ ﷺ نے رکھی تھی۔ وہ مبارک ہستی جس نے جنگ جیسے مکروہ حربے کو جہاد جیسے پاکیزہ جذبے میں بدل دیا تھا، جس نے بھٹکے ہوئے لوگوں کو سیدھے راستے پر چلایا، جس نے ظلم وستم کا خاتمہ کرتے ہوئے عدل وانصاف کا بول بالا کیا، جس نے اخوت ومحبت، ہمدردی اور بھائی چارے کا درس دیا اور جس نے کلمۃ اللہ کو ہر چیز پر غالب وحاوی کردیا تھا۔

اس انقلاب کے لیے ضروری ہے کہ کوئی ایسی تدبیر، کوئی ایسا حیلہ، کوئی ایسی سکیم اور کوئی ایسا فارمولا ضرور وضع کیا جائے جس کے تحت تمام اسلامی جماعتیں، تحریکیں اور امت مسلمہ ایک جگہ جمع اور متحد ہوجائیں۔ اس راستے میں اگر کسی کا طریق کار آڑے آرہا ہے تو اس طریقِ کار پر نظر ثانی کی جائے، کسی کا مزاج ناموافق ہے تو اسے موافق بنایا جائے، کسی کی انا رکاوٹ بنی ہوئی ہے تو اسے دور کیا جائے، کسی کی جماعتی مصلحت خلیج بنی ہوئی ہے تو اسے عبور کیا جائے، کوئی مسلکی تعصب فاصلہ بڑھائے ہوئے ہے تو اسے ختم کیا جائے۔

فرہاد اگر شیریں کے لیے دودھ کی نہر کھود سکتا ہے، رومیو جیولیٹ کے لیے سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوسکتا ہے تو ہم مسلک ومشرب کے ندی نالے امت کے ناپید کنار سمندر میں کیوں جذب نہیں کرسکتے؟ اگر مجنوں اپنی لیلیٰ کے لیے تکلیفیں برداشت کرسکتا ہے تو ہم فروعی اختلافات کیوں نہیں بھلا سکتے؟ اگر ہیر رانجھے کے لیے اپنا گھر بار چھوڑ سکتی ہے تو ہم اپنا شخصی پندار کیوں نہیں توڑ سکتے؟ اگر سوہنی مہینوال کے لیے کچے گھڑے کے سہارے چناب عبور کرسکتی ہے تو ہم ملی یکجہتی کے بل پر جماعتی خلیج کیوں نہیں پاٹ سکتے؟

اگر مجازی عشق پہاڑوں کا سینہ چیر سکتا ہے، تن کا ماس جلا سکتا ہے، خاندانی وقار بھلا سکتا ہے، دریا کی لہروں سے بے نیاز بنا سکتا ہے، تو ہم ٹھہرے عاشق حقیقی! کیا عشق حقیقی میں اتنی جرأت بھی نہیں کہ پہاڑ کا سینہ تو کیا دامن مصلحت ہی چاک کردے، تن بدن جلانا، آگ لگانا تو دور کی بات، صرف آہنگ ہی بدل دے، ترک دنیا نہ سہی شکست انا پر ہی آمادہ کردے۔

ہمارے نزدیک اس کا بنیادی سبب اہل نیکی کے درمیان ربط وتعاون کا فقدان ہے، ربط وتعاون بڑھانے کا واحد ذریعہ اپنی اپنی بغل میں چھپے ہوئے مرغ نکال کر اذان بلالی پر کان دھرنا ہے، یہی وہ اذان ہوگی جو نوید صبح لائے گی اور کفر اس کے سامنے دُم دَبا کر بھاگتا ہوا نظر آئے گا۔

پہلے ہر ساز کو ہم آواز کیا جاتا ہے
تب کہیں نغمے کا آغاز کیا جاتا ہے
عشق ایسے بھی مراحل سے گزرتا ہے جہاں
حُسن کو بھی نظر انداز کیا جاتا ہے

زمین کے اوپر عاجزی کے ساتھ رہنا سیکھ لو تو زمین کے نیچے سکون سے رہ پاؤ گے

عالم اسلام

رحیم الدین☆

مشرق وسطی اور داعش کی خلافت اسلامیہ

مکرمی ڈاکٹر صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

میری تجویز یہ ہے کہ البرہان کو ہر ماہ عالم اسلام کے حالات پر ایک مبسوط مقالہ پیش کرنا چاہیے۔ آپ خود بھی اچھا تجزیہ کر سکتے ہیں یا اپنے کسی فاضل دوست کے ذمے لگائیے، بہرحال اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے خصوصاً ان دنوں مشرق وسطی کے جو حالات ہیں اور شام، غزہ، عراق اور داعش کے حوالے سے جو کردار وہاں یہود ونصاری (امریکہ واسرائیل) ادا کر رہے ہیں، اس پر نظر رکھنی ضروری ہے۔

مجھے ذاتی طور پر آپ کی یہ تعبیر پسند آئی ہے کہ مغرب (امریکہ و یورپ واسرائیل) کی حیثیت دو مونہہ والے سانپ جیسی ہے جو دونوں طرف سے امت کو ڈستا ہے چنانچہ ایک طرف وہ سنیوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے تو دوسری طرف ان کے دہشت گردانہ کردار کو ابھارتا اور اسے ہوّا بنا کر پیش کرتا ہے اور اس سے علاقے کے سنی حکمرانوں کو خوف میں مبتلا کر کے (مثلاً سعودی عرب اور امارات کو) انہیں غلامی میں مزید جکڑتا اور ان کی رہی سہی دولت ان سے نکلواتا ہے تو دوسری طرف اہل تشیع کو ان کے خلاف منظم کرتا ہے اور اس طرح شیعہ سنی اختلاف کو بڑھاوا دے کر عوامی سطح پر بھی انہیں لڑاتا ہے اور ملکی سطح پر بھی چنانچہ اس نے مشرق وسطی میں سعودی عرب اور ایران کو دو متحارب فریق بنا کر ایک دوسرے کے خلاف لا کھڑا کیا ہے۔

پاکستان کے حالات بھی اس صورت حال سے متاثر ہو رہے ہیں۔ ایران اگر یہاں کے شیعوں کی پشت پناہی کرتا ہے تو سعودی عرب و امارات کی لابی بھی ان کے خلاف متحرک ہو چکی ہے۔ اس میں سپاہ

صحابہ کے علاوہ اب اہل حدیث بھی سعودی عرب کی حمایت میں میدان میں کود پڑے ہیں چنانچہ اہل حدیثوں کے پرچے 'محدث' کے شمارہ اگست میں ایک طویل 'معروضی' (؟) تجزیہ پیش کیا گیا ہے جس میں مدیر نے شیعی ایران کو تو خوب رگیدا ہے (اور وہ اس کا مستحق بھی ہے) لیکن سعودی عرب کو معصوم ثابت کیا ہے (جس کا وہ مستحق نہیں) کیونکہ سعودی حکمرانوں کا کردار ایران سے زیادہ رسوا کن ہے اور وہ مغرب اور امریکہ کے گماشتے کا کردار خوب نبھا رہا ہے۔ اس نے اسلامی کانفرنس تنظیم اور رابطہ عالم اسلامی کو گہری نیند سلا رکھا ہے، اخوان المسلمون کو دہشت گرد تنظیم قرار دے کر مصر میں فوجی آمریت کی حمایت کی ہے اور بالواسطہ طور پر فلسطینیوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپا ہے اور دوسری طرف امریکی اشارے پر ایران کے خلاف بھی اس نے سرد بلکہ گرم جنگ چھیڑ رکھی ہے۔ بنیادی مسئلہ جس پر سوچ بچار کی ضرورت ہے یہ ہے کہ امت کی سطح پر کوئی فرد اور ادارہ ایسا نہیں جو اس صورتِ حال کی اصلاح کے لیے موثر کردار ادا کر سکے۔

والسلام،

رحیم الدین، ڈسکہ (سیالکوٹ)

تبصرہ کتب　　　　مدیر

عصر حاضر میں دین کا متوازن تصور

از پروفیسر طارق بٹ

ہمارے دین کے منابع (قرآن وسنت) اگرچہ محفوظ ہیں جنہوں نے اس دین کے دوام اور شمول وکمال کی راہیں ہموار کی ہیں تاہم مرور وقت کے ساتھ ساتھ دین کی مختلف تعبیرات کا سامنے آنا یا مختلف عوامل کی بناء پر بعض غیر متوازن فکری رجحانات کا غلبہ اور تنوع بھی کوئی اچھنبے کی بات نہیں۔ ایسے حالات میں اصلاح وتجدید کی ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے تاکہ دین کا اصل چہرہ نکھر کر سامنے آجائے اور مذکورہ غیر متوازن تصورات کی کجی بھی لوگوں پر واضح ہو جائے۔ پروفیسر طارق بٹ صاحب کی موجودہ کاوش اس لحاظ سے بہت اہمیت کی حامل ہے کہ انہوں نے عصر حاضر میں دین کے ان تصورات کی نقاب کشائی کر دی ہے جو غیر متوازن ہیں اور ساتھ ہی دین کے متوازن تصور کی وضاحت بھی کر دی ہے۔

یہ کتاب دو ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں دین کے غیر متوازن تصورات کا ذکر ہے جن میں مسلک پرستی، دین کی جہادی تعبیر، تبلیغ ہی کو سب کچھ سمجھنا، تصوف کے بارے میں افراط وتفریط اور دین کی سیاسی، قدامت پرستانہ اور روشن خیال تعبیرات زیر بحث آئی ہیں۔ دوسرے باب میں عصر حاضر میں دین کے متوازن تصور کی وضاحت کی گئی ہے۔

۸۳ صفحات کا یہ کتابچہ عمار پبلی کیشنز، شاہ دین مارکیٹ اردو بازار لاہور نے شائع کیا ہے، اس کی قیمت -/۷۰ روپے ہے اور یہ مکتبہ البرہان کے علاوہ مندرہ ذیل جگہوں سے دستیاب ہے۔ لاہور: کتاب سرائے، بک ہوم کراچی: سعید بک بنک راولپنڈی: رائل بک ایجنسی ملتان: بیکن بکس

اسلامی فلاحی ریاست

از محمد وقاص خاں

مغربی جمہوریت نے ریاست کا جو فلاحی تصور پیش کیا ہے اس کے مقابلے میں مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلامی ریاست بھی درحقیقت فلاحی ریاست ہوتی ہے۔ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب اصولی مباحث پر مشتمل ہے جس میں مصنف نے اسلامی ریاست کے مقصد وجود، اس کے فلاحی تصور، اعضائے ریاست کا باہمی تعلق، قانون سازی اور اجتہاد اور اسلامی و غیر اسلامی ریاست کا فرق واضح کیا ہے۔ دوسرے باب میں نظام ہائے ریاست کا ذکر ہے یعنی اسلامی ریاست کا معاشی و تعلیمی نظام، اس میں خواتین اور غیر مسلموں کا کردار نیز ذرائع ابلاغ، جہاد فی سبیل اللہ، امور خارجہ اور بنیادی انسانی حقوق وغیرہ۔ تیسرے باب کا عنوان 'اسلامی ریاست کا قیام: چند نقوش راہ' ہے جس میں موجودہ مغربی تہذیبِ جہالت اور اسلامی تہذیب کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے اور انقلاب امامت کے ماڈلز پیش کیے گئے ہیں۔

مصنف کا اسلوب بیان سادہ، سلیس اور متوازن ہے اور یہ عام پڑھے لکھے لوگوں کے لیے بلاشبہ مفید ہے۔ تحقیقی لحاظ سے انگریزی اور عربی مراجع سے استفادہ نظر نہیں آتا اور بہت سے اہم مباحث مصنف کی توجہ حاصل کرنے سے محروم رہے ہیں مثلاً سب سے پہلے تو اسلام کے تصور فلاح کی وضاحت ضروری تھی کہ وہ ہے کیا اور اس میں فرد، معاشرے اور ریاست کا کیا کردار ہے۔ اسی طرح خلافت، مغربی جمہوریت، اسلامی جمہوریت اور عصر حاضر میں اسلامی ریاست کے قیام کے مناہج پر گفتگو ہونی چاہیے تھی کہ عصر حاضر میں کسی بھی جگہ صحیح اسلامی فلاحی ریاست کیوں نہیں قائم ہو سکی اور آئندہ اس کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے۔ اگر پاکستان کے صحیح اسلامی فلاحی ریاست بننے میں ناکامی کے اسباب کا تجزیہ اور مستقبل کے لیے راہ نما خطوط زیر بحث آجاتے تو کتاب کی اہمیت مزید بڑھ جاتی۔

۲۲۴ صفحات کی یہ کتاب محنت پبلی کیشنز واہ کینٹ نے شائع کی ہے اور مرکز تحریک محنت جی ٹی روڈ واہ کینٹ (فون 53-051-4904052) سے مل سکتی ہے۔ اس پر قیمت درج نہیں۔

انجینئر مختار فاروقی

جماعت اسلامی اور انتخابی سیاست

از پروفیسر طارق بٹ

پروفیسر طارق بٹ صاحب کی کتاب پر البرہان میں اپریل ۲۰۱۴ء میں تبصرہ شائع ہوا تھا۔ پچھلے ماہ اس کتاب پر ماہنامہ حکمت بالغہ جھنگ میں اس کے فاضل مدیر انجینئر مختار فاروقی صاحب کا تبصرہ شائع ہوا ہے جو بہت اہم ہے اور جماعت کی ناکامی کے اسباب میں ایک خاص فکری پہلو کے کردار کو نمایاں کرتا ہے۔ ہم منہج غلبۂ دین کے موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے 'حکمت بالغہ' کے شکریہ کے ساتھ اس تبصرے کو یہاں دے رہے ہیں۔ مدیر

یہ کتاب پاکستان میں ۲۰۱۳ء کے الیکشن کے نتائج میں جماعت اسلامی کی شدید ناکامی پر جماعت سے دردمندی کا تعلق رکھنے والے حضرات مثلاً ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری، مولانا خلیل الرحمن چشتی، ڈاکٹر محمد امین اور دیگر اہل علم کے مضامین کا مجموعہ ہے اور ہر تحریر سے دردمندی کے جذبات جھلکتے ہیں۔ یہ کتاب جماعت اسلامی سے جذباتی تعلق رکھنے والے ہر شخص کو مطالعہ کرنی چاہیے تاکہ آئندہ کا صحیح لائحۂ عمل تیار کیا جا سکے۔

جماعت اسلامی کے بانی مولانا مودودی صاحب ایک عظیم بیدار مغز مذہبی دانشور تھے جنہوں نے اسلامی مذہبی ماحول میں پرورش پائی تھی اور مغرب کے افکار کا بھی کھلی آنکھوں اور کھلے دماغ کے ساتھ مطالعہ کیا تھا۔ جماعت اسلامی کی تشکیل ان کے اسلام کی سربلندی کے لیے نظریاتی بنیادوں پر کام کرنے کی حتمی شکل تھی۔ مولانا مودودی کی نگاہ نے 'رفتارِ زمانہ' کو بھانپنے میں اپنی خود اعتمادی کی وجہ سے Under Estimate کیا اور ان کی توقعات و خدشات سے کہیں جلد علامہ اقبال کی شاعری سے بیدار ہونے والی مسلمان اُمت نے انہی کے نظریات کو عملی شکل دینے کے لیے ایک عظیم ریاست قائم کر دی۔ مولانا مودودی صاحب کے لیے اپنے نظریاتی کام کے لیے 'بھارت' زیادہ موزوں تھا مگر بعض تاریخی اور جغرافیائی عوامل کی وجہ سے مولانا مودودی صاحب نے پاکستان آنے کا فیصلہ فرمایا۔ یہاں آ کر وہ نظریاتی کام اور عملی سیاست کی دو ناقابل عبور انتہاؤں میں ہی پھنس کر رہ گئے۔ انہیں اس کا احساس جلد ہو گیا تھا مگر جماعت تاحال اسی صورت حال سے دوچار ہے۔ یہ خلاصہ ہے ان نگارشات کا جو اس کتاب میں مختلف ہمدردانِ جماعت نے سپردِ قلم کی ہیں۔

ہمارے نزدیک مولانا مولانا مودودی صاحب کا نظریاتی کام ایک خاص رُخ پر تھا اور اس کے

منطقی نتائج بھی سامنے ہیں۔ اُصولوں کو بدلے بغیر طریق کار بدلنے کا فائدہ نہیں اُلٹا نقصان ہی ہوگا۔ اس اجمال کی تفصیل کچھ یوں ہے:

آج اُمت مسلمہ تقریباً دو ارب افراد کا مجموعہ ہے اور اس میں سیکڑوں قسم کے خیالات اور دینی تشریحات کا وجود اچنبھے کی بات نہیں۔ قرآن مجید اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موجودگی میں صرف یہ غنیمت ہے کہ یہ انتشار دوسری قوموں اور مذاہب کی نسبت کم ہے اور مختلف مسالک اور ان کے اکابرین دلیل کی بات سنتے بھی ہیں اور قبول بھی کرتے ہیں، عوام کی سطح کے مقررین وواعظین کا معاملہ دوسرا ہے۔

دورِ صحابہؓ میں بھی آراء کا اختلاف تھا جو بعد میں پھیلا تو کچھ اُصولوں کی بنا پر چار فقہی مذاہب کی شکل میں سامنے آیا۔ اصحابِ ظاہر کا معاملہ بھی دورِ صحابہؓ سے تھا لہٰذا...... اہل سنت میں ایک فقہی تقسیم چار فقہی مذاہب اور اصحابِ ظاہر کا مسلک ہے اور بلا شبہ ہر گروہ میں بہت بھاری بھر کم علمی و روحانی شخصیات موجود ہیں۔ اس طرح نظریاتی سطح پر، جنہیں مرورِ زمانہ کے ساتھ دورِ صحابہؓ کے بعد 'عقائد' کا نام دیا گیا، دو علیحدہ علیحدہ دھارے وجود میں آ گئے ایک سلسلہ اشاعرہ وماتریدیہ سے ہو کر عقیدہ طحاویہ اور عقائد نسفی کے نام سے موسوم ہوا...... تو دوسرا عقیدہ واسطیہ کے نام سے ہمارے علمی ورثہ میں موجود ہے۔

عقائد کے میدان میں یہ فرق صرف تعبیر کا فرق ہے حقیقت ایک ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ، فرشتے، آخرت، روح، وحی، جنت ودوزخ، احوال قبر وغیرہ وغیرہ بس ان کو سمجھ کر بیان کرنے میں بہت اختلافات ہو سکتے تھے مگر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے صرف دو نقطہ ہائے نظر تک یہ اختلاف محدود ہو گیا ہے۔ اب عملاً ایک ہزار سال سے جو شخص بھی اُمت میں نمایاں ہوتا ہے اور کوئی دینی علمی کام کرتا ہے وہ پانچ فقہی مسالک میں سے ایک اور عقائد کی دنیا میں دو نقطہ ہائے نظر میں سے کسی کا ضرور اسیر نظر آتا ہے۔ پہلے نقطۂ نظر کے حامل شیخ عبدالقادر جیلانی، امام غزالی، شیخ ابن عربی وغیرہ ہیں جب کہ دوسرے نقطۂ نظر کے حامل امام ابن تیمیہ، شیخ محمد بن عبدالوہاب، مولانا مودودیؒ وغیرہ ہیں۔

ایک ہزار سالہ تاریخ کے نتیجے میں سیاسی، جغرافیائی اور دیگر متعدد عوامل کی وجہ سے اسلامی دنیا میں کہیں ایک قسم کے فقہی مذہب کا فروغ ہوا اور وسیع علاقہ اس کے زیر اثر چلا گیا، کہیں دوسرے مذہب کا۔ اور نظریاتی سطح پر بھی کسی علاقے میں ایک نقطۂ نظر کو قبولِ عام حاصل ہو گیا اور کہیں دوسرے نقطۂ نظر کو۔

جنوبی ایشیا میں اگر چہ اسلام کا دورِ اوّل دورِ صحابہ اور دور بنواُمیہ کا ہے جب محمد بن قاسم نے ہند پر حملہ کر کے اسلامی حکومت قائم کر دی۔ یہ حکومت جلد ہی انتہا پسندی کے نظریات کے حاملین (اسماعیلی شیعہ) کے ہاتھوں میں چلی گئی جب کہ دورِ ثانی محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری کی فتوحات کے بعد ۱۲۰۶ء میں اسلامی حکومت کے قیام سے شروع ہوا۔ اس اسلامی حکومت کے قیام اور عوام کو مسلمان بنانے

میں صوفیاء صالحین کا بڑا کردار تھا...... گویا پورا (غالب اکثریت) جنوبی ایشیا شیخ عبدالقادر جیلانی، امام غزالی اور ابن عربی کے نقطۂ نظر کا حامل بھی بنا اور فقہ حنفی کا ایک مضبوط گڑھ بھی۔ یہاں مجددین کے ہاتھوں اصلاحی کام بھی ہوا تو ان فقہی اور نظریاتی دائروں کے اندر اندر ہی۔

اس تفصیل کے بعد ہی یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ مولانا مودودی صاحب نے نظریاتی کام کا آغاز کیا وہ مذہباً علمائے ظاہر میں سے تھے (یعنی کسی فقہی مذہب کے پیروکار نہیں تھے) ور'عقیدہ' اور نظریاتی سطح پر وہ امام ابن تیمیہؒ کے پیروکار تھے۔

ان کا کام ہمارے نزدیک نظریاتی سطح کا...... ہر باصلاحیت اور دردمند مسلمان کی طرح مسلمانوں کی اصلاح کے لیے کوشش کرنے کا ہر شخص کو حق ہے اور اپنے مذہب و نظریہ کو پھیلانے کا بھی، اس میں نہ چاہتے ہوئے بھی بعض اوقات مناظرے، منافشات، تلخیاں ہو جانا انسانی طبائع کے اختلاف کا نتیجہ اور فطری امر ہے۔ اس سے نفس مضمون پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

مولانا مودودیؒ کا یہ نظریاتی کام...... ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے نزدیک بھی ٹھیٹھ اُصولی اسلامی نظریات کے قریب تھا۔ وہ یہ کام کرتے رہتے تو اس پر کوئی قدغن نہ پہلے تھی نہ آج ہے حتیٰ کہ ان کے پیروکاروں کا حلقہ وسیع ہو کر کسی ایک علاقہ میں اپنی آزاد حکومت بنانے میں کامیاب ہو جاتا۔ مگر اُنہوں نے پاکستان بننے کے بعد ایک دوسرا راستہ اختیار کر کے اپنے نظریات اور مذہب پر حنفی اور غزالی و رومی و ابن عربی کے ماننے والوں سے مہر تصدیق ثبت کرا کر حکومت بنانے کی کوشش کی جو یقینا ناکام ہونی تھی اور ہو رہی ہے اور ہوتے رہی گی جب تک اس ملک کے عوام کی اکثریت علمائے ظاہر کے مسلک (سلفیت، اہل حدیث) کے حامل نہیں ہو جاتے اور امام غزالی و رومی و ابن عربی کے نظریات کو خیرباد کہہ کر کے ابن تیمیہؒ کے نظریات کو اختیار نہیں کر لیتے۔

ہمارے نزدیک نظریاتی کام کے تقاضے اور تھے اور سیاسی کامیابی کے تقاضے اور تھے...... مولانا مودودی صاحب اور ان کی جماعت اس تضاد کا شکار ہے۔ کامیابی کی صورت موجود ہے کہ وہ عوام کے مذہب اور نظریات قبول کرنے کا صدقِ دل سے اعلان کر دیں...... لوگ اعتبار بھی کر لیں...... تو کامیابی یقینی ہے مگر کیا عملاً یہ ممکن ہے؟ اللہ بہتر جانتا ہے۔

اس صورتِ حال کے صحیح فہم و ادراک کے لیے فوری تقابل کے طور پر قیامِ پاکستان سے پہلے علامہ اقبال کی مثال دی جا سکتی ہے۔ علامہ اقبال غزالی کے مداح ہیں، ابن عربی کے خوشہ چین ہیں (تصوف میں جمود اور بے عملی کے خلاف برہنہ شمشیر ہیں) مولانا روم کے مرید ہیں۔ جنوبی ایشیا کے معلم عوام کے

اجتماعی ضمیر نے اس 'شاعرِ بے نوا' ایک فردِ واحد جس کی کوئی جماعت نہیں، کی آواز پر لبیک کہی اور امت ڈھاکہ سے طورخم تک بیدار ہوگئی......انگریزی استعمار کے منصوبوں کے خلاف سیسہ پلائی دیوار بن گئی اور قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں پاکستان کا قیام ممکن ہوگیا۔ چند سال قبل برطانیہ میں سرکاری کاغذات کے عام ہونے سے جو بات سامنے آئی کہ برطانوی حکومت نے اعتراف کیا ہے کہ برطانوی ہند کی تقسیم نہ انگریز کا منصوبہ تھا نہ ہندو چاہتا تھا، یہ صرف ایک شاعر محمد اقبال علیہ الرحمۃ کی شاعری نے عوامی بیداری پیدا کردی تھی، جس سے تقسیم ہند ممکن ہوسکی۔

اسی طرح کا معاملہ گزشتہ صدی کی ایک دوسری شخصیت مولانا ابوالکلام آزاد کا ہے، ان کے جوش اور جذبے اور جذبۂ حریت واستخلاصِ وطن کا کون انکار کرسکتا ہے مگر حضرت شیخ الہندؒ کی تائید کے باوجود وہ جمعیت علمائے ہند کے اجلاس میں 'امام الہند' نہ بن سکے، وجہ یہی تھی۔ وہ چاہتے تو حکومت الٰہیہ کے قیام کے لیے خاندانی مناسبت سے تصوف یعنی غزالی کے نظریات کی اصلاح بھی کرتے اور قبول کر کے آگے بڑھتے تو حالات کیا ہوتے مگر......انہوں نے اپنے نظریات کے لیے حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے اعلیٰ مقصد کو بھی قربان کردیا۔

اس مسئلے کی مزید توضیح کے لیے عرض ہے کہ کسی علاقے کے مسلمانوں کے اجتماعی نظریات کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ ان کی اصلاح کی کوششیں ہوسکتی ہیں مگر ان کو نظر انداز کر کے کوئی سیاسی منصوبہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔ برصغیر میں ایک صدی قبل امام ابن تیمیہؒ کے نظریات کا حامل ہونا اوران کی ترویج کا علم بلند کرنا اپنی جگہ ایک کام تھا مگر اس بنیاد پر عوامی پذیرائی اور تائید کے حصول کا دعویٰ یہ خلافِ عقل کام تھا۔

جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی عظیم اکثریت علامہ اقبال کی آفاقی نظموں شکوہ (۱۹۱۱ء)، شمع وشاعر (۱۹۱۲ء)، جوابِ شکوہ (۱۹۱۳ء) طلوعِ اسلام کے ساتھ خلافت اسلامیہ کے قیام اوراس کی آفاقیت اور عالمگیریت سے مسحور تھے اور یہ حقائق علامہ اقبال نے حضرت محمد ﷺ کی احادیث کے ذخیرہ سے ہی نکال کر عوام کے سامنے رکھے تھے۔

آج بھی عوام ۱۹۳۰ء کے خطبہ الٰہ آباد اور ابلیس کی مجلس شوریٰ جیسی نظموں کے تصورات کے حامی ہیں۔ اسلام کے سیاسی نظام کو نظام خلافت سمجھتے ہیں۔ مساواتِ انسانی، حقوقِ نسواں کا تحفظ، پردہ، حریت، بھائی چارہ، معاشی عدل اور درویش حکمرانی کے تصورات ان کے خواب ہیں جب کہ پاکستان کے موجودہ سیاسی منظر نامے میں نظامِ خلافت اوراس کے قیام کی اصطلاحات ہی ناپید ہیں۔ علامہ اقبال کے افکار کا یہ سحر پاکستان کے عوام کی اجتماعی یادداشت میں آج بھی زندہ ہے بلکہ بھارت اور بنگلہ دیش کے مسلم ضمیر سے بھی محو نہیں ہوسکا۔

یہ ایسے ہی ہے کہ آج سعودی عرب کے شہر ریاض میں علامہ اقبال کے نظریات کے فروغ کے لیے کام کیا جائے (کوئی کام کرنے دے گا یا نہیں یہ الگ بات ہے شاید جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی طرح وسعت قلبی وہاں سامنے نہ آسکے) مگر اس کام کے آغاز کے چند سال بعد ہی یہ سمجھ لینا کہ سارا عرب علامہ اقبال کے افکار کا مدّاح ہو گیا ہے یہ غیر منطقی بات ہو گی۔

ہمارے نزدیک جماعت اسلامی یا مولانا مودودی صاحب کے افکار کی عدمِ مقبولیت کی یہ ناگزیر بنیادی وجہ ہے اور اس کے ہوتے ہوئے مستقبل قریب تو کیا مستقبل بعید میں بھی ان نظریات کی بنیاد پر جمہوری انداز کی کامیابی ناممکن ہے۔

گزارش ہے کہ ان سطور پر علمی گفتگو اور جذبہ اصلاح کے انداز سے ہی دیکھا جائے تو بہتر ہوگا۔ ہمارے نزدیک امام غزالی اور امام ابن تیمیہ دونوں قابل احترام ہیں۔ ماضی میں ابن عربی علمائے ظاہر میں سے تھے مگر نظریات وہ تھے جو غزالیؒ اور مولانا رومیؒ کے تھے یا شیخ عبدالقادر جیلانی حنبلی مسلک کے باوجود روحانیت، روحانی ترقی، تعلق مع اللہ اور اس طرزِ فکر کی دیگر تفصیلات جسے عرف عام میں تصوف کہتے ہیں، کے پیروکار تھے۔